کرنل محبوب احمد

- آزاد ہند فوج کی کہانی
- سُبھاش چندر بوس کی کہانی
- میری اپنی کہانی

خُدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

- آزاد ہند فوج کی کہانی
- سُبھاش چندر بوس کی کہانی
- میری اپنی کہانی

کرنل محبوب احمد

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

تقسیم کار:

صدر دفتر:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ــــ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ــــ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ــــ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ــــ ۲۰۲۰۰۲

۱۹۹۴ء

قیمت : پچیس روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) نئی دہلی میں طبع ہوا

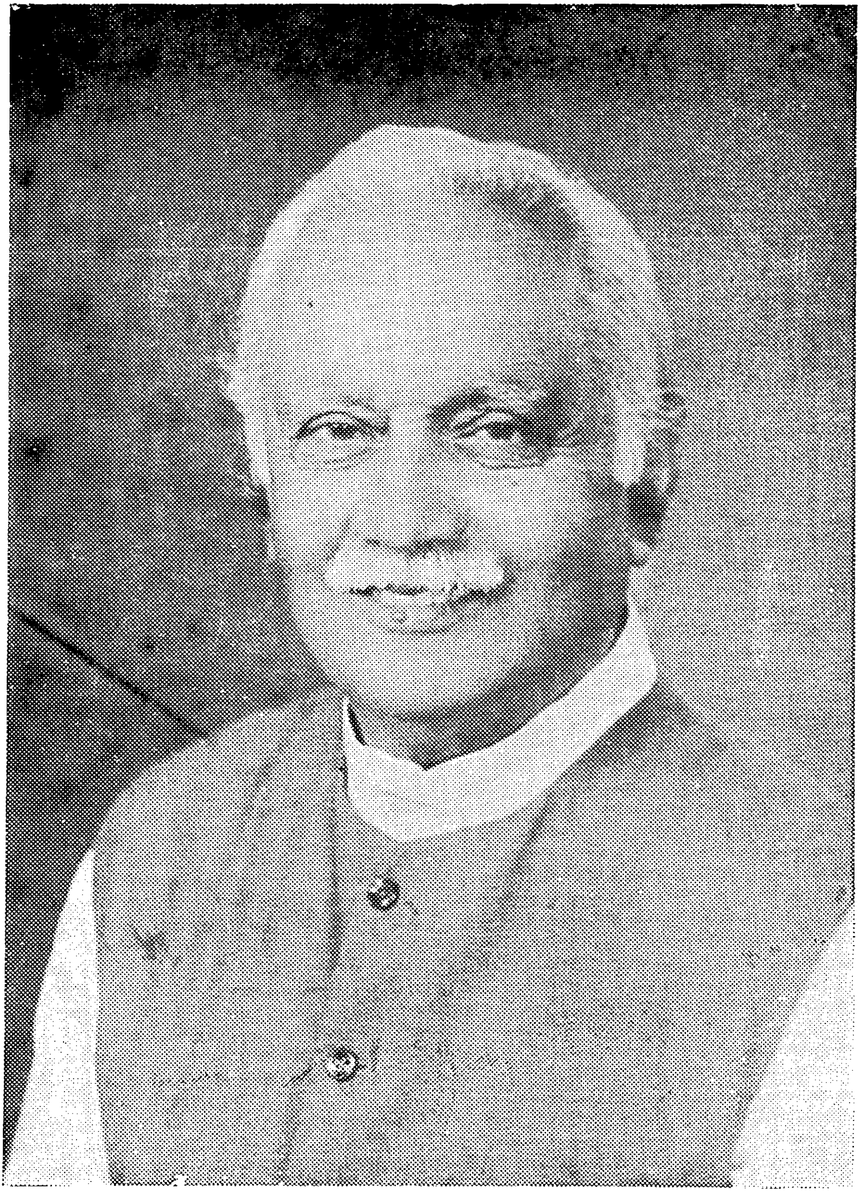

کرنل محبوب احمد ——————— (۱۹۲۰ء—۱۹۹۲ء)

حرفِ چند

ہندستان کا محبوب، بہار کا محبوب، پٹنہ کا محبوب، زینت بھابی کا محبوب، عمران، عدنان، عالیہ کا محبوب! جو ۱۹ر مارچ ۱۹۹۳ء کو آج ہمارے ساتھ ہوتے تو ۷۳ سال کے ہوتے جو پچھلے سال ۹ر جون کو اپنے مالک سے جا ملے۔

کرنل محبوب! آزاد ہند فوج کے ایک ایسے جوان کا نام ہے، جسے ہندستان کی آزادی کی جنگ نیتا جی سبھاش چندر بوس کی قیادت میں لڑنے کا فخر حاصل ہے۔ جو "آزاد ہند" فوج کے سپہ سالار کے معتمد کے عہدے پر فائز ہوئے جو نیتا جی کے قریب ترین ساتھیوں میں تھے اور جنگی نعرہ "دلّی چلو" کے مناد رہے۔ ۱۹۲۰ء میں بمقام پٹنہ، پیدا ہوئے۔ فوجی تعلیم اور تکمیل دہرہ دون کے رائل انڈین ملٹری کالج۔ اور ملٹری اکیڈمی میں ہوئی آل انڈیا انٹرنس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انکی تقرری برٹش انڈین آرمی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں محبوب صاحب نے "برٹش انڈین فوج کی نوکری چھوڑ کر اپنی خدمات "آزاد ہند فوج" کو سپرد کر دیں۔ ۱۹۸۵ء میں روزنامہ "پاٹلی پترا ٹائمس" (پٹنہ) کے خاص اصرار پر کرنل صاحب نے "آزاد ہند آرمی" کے زمانے کے اپنے فوجی تجربات وغیرہ کے بیان کرنے کے لیے ہامی بھر لی۔ آزادی کے لیے جوش و خروش، سرفروشی، اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی اس بالکل اچھوتی کہانی کو ترتیب دینے والے ہیں ادھیش / ریتندر۔ جس کا اردو ترجمہ (مترجم عابد امام زیدی) پیش خدمت ہے، اس شریف ہندستانی کی پہلی یاد کے موقع پر، جسے پچھلے سال ۹ر جون کو اس کے رب نے اپنے حضور بلا لیا۔

ع ر ب
۱۹ر مارچ ۱۹۹۳ء

کچھ اپنے بارے میں

"میری پیدائش اسی شہر (پٹنہ) اسی محلّہ (یحییٰ پور/یوسفہ؟) میں آج سے ستّر سال قبل ہوئی*۔ میرے والد غریب گھرانے کے تھے۔ اسٹریٹ لیمپ کے نیچے پڑھا، ٹیوشن پڑھاتے، کچھ اسکالرشپ بھی ملتا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ گھر پر ان کی فیس دو روپے، باہر نکلنے پر چار روپے۔ بڑے خاکسار آدمی تھے، کہا کرتے تھے —— "خدا سب کچھ معاف کر دیتا ہے مگر غرور کو کبھی معاف نہیں کرتا۔"

جب میں گیارہ برس کا تھا تو میرے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا جو مجھ سے دو برس چھوٹا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے والد نے دہرہ دون بھیج دیا، اس وقت میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ میں پہلا بہاری تھا، میرے جانے کے چھ ماہ بعد کرنل ان کے سنہا صاحب دہرہ دون آئے۔ ایک سال بعد میں وہاں فٹبال کیپٹن بنا۔ ہمارے اسکول میں لڑکوں کی تعداد صرف ۱۲۰ ہوتی تھی، اور ٹیچر ۱۷/۱۹۔ اس کے بعد انڈین ملیٹری اکیڈمی گیا۔ سال میں دو بار آل انڈیا کمپٹیٹو اکزامینیشن ہوتا ہے، جس میں پندرہ لڑکے لیے جاتے ہیں۔ میں پہلی دفعہ کامیاب نہیں ہوا، دوسری بار کامیاب ہوا۔

ہم لوگوں نے جان پر کھیل کر ہندستان کی آزادی کی لڑائی لڑی۔ ہمارے کتنے جانباز شہید ہوئے۔ ہمارے سامنے ایک سپنا تھا، ایک خواب تھا، آج جو کچھ ہم دیکھتے ہیں دل دکھتا ہے۔ دل کو چوٹ لگتی ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے کہ اللہ ہمارے جرم کی سزا دے رہا ہے۔ ہم نے کوئی گناہ ضرور کیا ہے جس کی وہ ہمیں سزا دے رہا ہے۔"

[خدا بخش لائبریری میں ایک لکچر: "شخصیات اور واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا"]

---

* وفات: ۹ر جون ۱۹۹۲ء۔ پٹنہ، پھلواری شریف (خانقاہ) کے قبرستان میں تدفین ہوئی

موت کی مستی جینے کا سکھ

عمر کے اس پینسٹھویں پڑاؤ پر اپنے گزرے ہوئے وقت کو مڑ کر دیکھنا شاید انسانی کمزوری بھی ہے اور ایک فطری معاملہ بھی۔ اپنے ماضی کو بار بار چھو لینے کی یہ بیتابی اگر میرے اندر کہیں ہے تو یہ صرف اس لیے نہیں کہ میں ماضی کے متعلق زائد طور پر اپنے اندر شیفتگی کے جذبے رکھتا ہوں دراصل میری عمر گزشتہ اور موجودہ عمر رواں میں اگر روشنی کی کچھ تھوڑی بہت جھلک باقی رہ گئی ہے تو، آج کے گرد و غبار میں اور تیرہ و تار ماحول میں اس کے ہونے کی ایک اہمیت ہے۔ یہ روشنی بچا لی

جانی چاہیے ——— کہ موجودہ ہندوستان کی لرزیدہ ہتھیلیوں پر روشنی کا یہ دیا بیحد ضروری ہے کہ روشنی ہمارے عقیدے کا عکس ہے کہ روشنی زادِ سفر ہے۔ اور راستے.... کتنے سارے راستے.... راستوں سے بھری پڑی یہ زندگی اور راستوں کے درمیان الجھے ہوئے لوگ.... اپنی اپنی منزل پانے کے لئے اپنے اپنے راستوں کی تلاش۔ یہ تلاش مسلسل ہے.... لگاتار اور مستقل ہے۔ لیکن کون سی منزل.... کیسی منزل؟ ہاں، آج بھی یہ تلاش جاری ہے۔ پورا ملک بھاگ رہا ہے.... بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ راستے صرف راستے۔ بھاگتے ہوئے لوگ پتہ نہیں کس منزل تک جا رہے ہیں۔ ہندوستان کو کہاں لے جا رہے ہیں....؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان راستوں اور اس بھاگم.... بھاگ کی کہیں کوئی منزل ہی نہیں؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

میرے ملک نے بہت پہلے جو سفر شروع کیا تھا اس کا مقصد طے تھا، اس کی منزل طے تھی، لیکن جو طے تھا وہ کہاں ہوا اور جب کچھ بھی طے نہیں ہے تب بھلا ہوگا کیا؟

ایک عجیب سی دہشت جاری ہے۔ بے مقصد، بے منزل کسی دوڑ، کسی تلاش کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

وجہ! ہاں، تب ایسا نہیں تھا۔ تب جینے کی وجہ تھی، مرنے کی بھی۔ مرنا کتنا رونگٹے کھڑے کر دینے والا، مگر کتنا تفخر آمیز احساس تھا تب۔ سر پر کفن باندھ کر موت کی مستی، جینے کا سکھ!

یاد آتا ہے، اس مستی میں شرابور اپنا ملک! یاد آتا ہے، یاد آتا ہے ملک کا وہ جنون اور یاد آتا ہے شہادت کے لیے تیار اپنے وقت کا ہر چہرہ! ملک کی آزادی کے لیے قربان ہونے کا وہ پاک جذبہ۔ یادوں کے اس البم میں چہرے، چہرے اور صرف چہرے ہیں۔ ہر چہرہ اپنا سا لگتا ہے بیحد اپنا۔ ہاں! وہ سارے میرے ارد گرد تھے۔ میرے دوست میرے ہمسفر کی طرح۔ یاد آتا ہے کیپٹن رام سنگھ، شوکت ملک، کرنل حبیب، شاہ نواز خاں اور اپنے بے حد عزیز نیتا جی تک کا چہرہ۔ آج بھی ان کی یادیں ——— سارے جسم میں سنسنی بھر دیتی ہیں۔ رواں رواں فرحت انگیز ہو اٹھتا ہے۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس ایک بے حد خوبصورت، وجیہہ اور کشیدہ قامت انسان جس کی ہمت اور جوش کے تصور سے آج بھی بازوؤں میں توانائی اور جنبش سی محسوس ہونے لگتی ہے کانوں میں بڑی دیر تک "جے ہند" صدائے جرس بن کے گونج اٹھتا ہے۔

وہ ۱۹۴۳ء کا ایک خوش قسمت اور خوشگوار دن تھا جب سنگاپور میں پہلی بار نیتا جی کا خواب دیکھنے اور سننے کا موقع ملا تھا۔ تب میں "برٹش انڈین فوج" میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ "انڈین ملیٹری اکادمی" میں آل انڈیا انٹرنس اکزامینشن پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں مجھے اس عہدے پر بحال کیا گیا تھا اور تب میں فوج ایک دستے

کے ساتھ ملایا بھیج دیا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہٹلر کی فوج پورے یورپ کو روندنے کے لیے بیتاب ہو اٹھی تھی۔ ملایا کے مورچے پر میری تعیناتی فوجی زندگی کی نئی شروعات تھی۔ ۱۹۴۳ء کے ابتدائی دنوں میں مجھے سنگاپور بلالیا گیا۔ یہیں نیتاجی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کیتھے بھون میں ایک جلسۂ عام میں بول رہے تھے: "یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہم ایسے وقت پر پیدا ہوئے جب ہم اپنے ملک کی خدمت کر سکتے ہیں۔ آج ہمارا ملک غلام ہے۔ اس غلامی کی زنجیر کو توڑنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ دیش کے اندر تو لوگ آزادی کے لیے لڑتے ہیں ضرور، لیکن گوری حکومت ان پر گولی چلاتی ہے اور ان کو دبا دیتی ہے۔ ہم لوگ جو ہندوستان کے باہر ہیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم سبھی ایک مقام پر جمع ہو کر، ایک مضبوط فوج تیار کر کے ہندوستان کی آزادی کے لیے آگے بڑھیں۔" نیتاجی کی آواز کا جادو اتنا پُر اثر تھا کہ سارا ماحول گوش بر آواز ہو گیا تھا۔ ان کی آواز نے لوگوں کے دل مسحور کر لیے تھے۔ رگوں میں خون اُبلنے لگا تھا اور ہم انہیں پوری طرح مبہوت ہو کر سن رہے تھے "ہندوستان کے اندر آج جو غریبی پھیلی ہوئی ہے اس کی اصل وجہ انگریزی سامراج کی استحصالانہ پالیسی ہے۔ اس غریبی کو دور کرنے کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں پر ہے۔ یہاں اتنی غریبی ہے کہ کسان اپنے ایک جوڑ بیل کو ٹھیک سے کھلا تک نہیں پاتا ہے جبکہ ساری فصل اور اناج کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ ایک کسان کے لئے اس سے بڑھ کر اور دُکھ کی بات کیا ہو سکتی ہے؟ اس لیے جب تک ہم اکٹھے نہ ہو جائینگے، انگریزی حکومت 'پھوٹ ڈالو، حکومت کرو' کی پالسی اپنا کر ہندوستان میں جمی رہے گی۔ کیتھے بھون میں گونجتی ہوئی تقریر اور اس کا ہر لفظ سامعین کے دلوں کو مشتعل اور متحرک کر رہا تھا اور وہ شیر کی گرج سب سے پوچھ رہی تھی" خون خون کو پکارتا ہے : پہاڑی کے اس پار، وادی کے اس پار، سمندر کے اس پار، بھائی بھائی کو بلاتا ہے ماں بیٹے کو بلاتی ہے۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم انہیں آزادی دلائیں؟ اپنی ماں کو اس طرح بیڑیوں میں جکڑا ہوا کب تک دیکھتے رہیں گے ہم؟" اس سوال کے ساتھ ہی وہ آواز تھم گئی۔ لیکن میں نے دیکھا ہر طرف، ہر کہیں ہر کسی کے اندر اس آواز کی بازگشت جاگ رہی تھی۔ جلسہ میں موجود ہر ہندوستانی اپنے دل میں ایک عجیب بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ لوگوں کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ آواز کا جادو سر چڑھتا ہوا دیکھا تھا۔ فیصلے کا وہ لمحہ گرچہ بہت مختصر تھا مگر بہت زیادہ اہم۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ برطانوی سرکار کی دی ہوئی یہ فوجی ملازمت میرے لئے نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے ناتے میرا پہلا فرض مادر وطن کی آواز پر لبیک کہنا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مادر وطن مجھے ادائے فرض کے لئے للکار رہی ہے۔ میں یک بیک اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی سنجیدگی سے بول اٹھا "نیتاجی! میں دیش کے لئے اپنے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے لیے میری

ہر طرح کی آزمائش کی جاسکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی سرزمین وطن کے لئے پہلا قطرۂ خون جو گرے وہ میرا ہو۔" اور میرے اس اعلان کے ختم ہوتے ہوتے جیسے اس جلسہ میں موجود لوگوں کو کوئی راہ مل گئی ہو جیسے سینوں میں دبے ہوئے عزائم کی چنگاریوں نے لہجہ و تقریر کی صورت اختیار کر لی ہو۔ ایک ساتھ ہزاروں آوازیں گونج اٹھیں ——— "ہم ملک کے لیے شہید ہونے کو تیار ہیں۔" آزادی کے دیوانوں کا وہ جوش غالباً "کیسھے بھون" کی تاریخ کا وہ پہلا دن تھا جب اس نے دیکھا کہ پرائی سرزمین پر مادرِ وطن کے لیے قربان ہونے کا جذبہ کتنا پاک اور جنون انگیز ہوتا ہے۔ "کیسھے بھون" اس کا چشم دید شاہد ہے ان جذباتی لمحات کا جب اس جلسے میں موجود ایک ستر برس کی ضعیفہ نے چاقو سے اپنی انگلی کاٹ کر نیتاجی کے ماتھے پر خون کا ٹیکہ لگاتے ہوئے ان کی کامیابی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی تھیں۔ وہ نقشہ آج بھی آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ میری آنکھیں آج بھی پرنم ہو جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں، یا خدا وہ کونسی طاقت تھی جس نے بچوں سے لیکر بوڑھوں تک میں قربانی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا جس نے وطن کی مٹی کا قرض ادا کرنے کے فرض کی یاد دلا دی تھی۔ سارا بھون "جے ہند" کے نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ میرے بلند حوصلوں کو دیکھ کر نیتاجی نے نوتشکیل شدہ "آزاد ہند فوج" میں مجھے بھرتی کر لیا تھا۔ وہ لمحہ، وہ دن میری زندگی کا سب سے زیادہ کیف انگیز دن تھا۔

چین ہل ہا کا

۲۹ راگست ۱۹۴۳ء یعنی "آزاد ہند فوج" میں بھرتی ہونے کے ایک مہینہ بعد مجھے نمبر ایک "سبھاش رجمنٹ" کا ایڈجوٹنٹ ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ یہ نیتاجی کی تجربہ کار آنکھیں تھیں جنہوں نے میرا جائزہ لیکر اتنے مختصر سے عرصے میں رجمنٹ کے کمانڈر جنرل شاہ نواز خاں کا دست راست بنایا۔ ایڈجوٹنٹ کے عہدہ پر متعین ہو کر رجمنٹ کی دیکھ بھال کرنا اور اسکی کارروائیوں کی رپورٹ کمانڈر تک پہنچانی یہ کارہائے ضروری میرے فرائض تھے۔ معلوم نہیں ایسی کیا بات تھی جس نے نیتاجی کی نظروں میں مجھے اتنا وقیع بنا دیا تھا۔ لیکن یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ نیتاجی کا یقین محکم اور قیادت کی بے مثال اہلیت ہی آزاد ہند فوج کی سب سے بڑی طاقت تھی۔

سبھاش رجمنٹ میں بطور ایڈجوٹنٹ میرا پہلا مورچہ تھا بھارت برما سرحد پر، چین ہل ہا کا۔ اسی مورچے پر ہماری مڈبھیڑ پہلے پہل برطانوی فوج سے ہوئی تھی اور اس تصادم میں آخر کار ہم کامیاب بھی ہوئے تھے۔ وہ خوشی آزادی کی ہماری دیوانگی کو اور بھی زیادہ پرجوش بنا گئی تھی۔ ہم نے اپنے ملک کو جو آزاد کرانے کا خواب دیکھا تھا اس کی سچائی پر پہلی مہر تھی یہ۔ اس دن نیتاجی نے رجمنٹ کے سبھی سپاہیوں کی پیٹھ تھپکا کر شاباشی دی تھی اور میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "محبوب ۲۳ برس کی عمر میں تم نے تو کمال کر دیا۔" شاہ نواز نے مجھے بتایا ہے نیری فوجی تنظیم اتنی بہترین تھی کہ گوری فوج کے ناخداؤں کو ناکوں چنے چبانے پڑے۔ آزاد ہند فوج کی تاریخ

میں تیرا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا اور آنے والی نسل یہ جان سکے گی کہ آزاد ہند فوج میں ایک ایسا بھی سپاہی تھا جس کے لئے مذہب، جسم اور اعزاز سے بڑھ کر تھی ہندوستان کی آزادی"۔

نیتاجی کا کہا ہوا لفظ لفظ کسی غیبی طاقت کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کرنے لگا تھا۔ اس وقت لگا تھا جیسے یہ آواز کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ اپنے ملک کی کروڑوں روحوں نے جیسے دعا دی تھی مجھے۔ میرا رواں رواں تشکر و احسان سے بھر اٹھا تھا۔ میں نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا تھا ـــــ "نیتاجی! اگر آپ مجھے حکم دیں تو اسی لمحہ ملک کے لیے اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون نذر کر سکتا ہوں" نیتاجی نے میرے کندھوں پر مطمئن انداز سے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ۱۹۴۳ء کا آخری مہینہ طے ہوا کہ یکم نومبر کو "سبھاش رجمنٹ" کو اوکھرول مورچے بھیجا جائے۔ امفال (منی پور) کے نزدیک تھا یہ اوکھرول مورچہ۔ اس مورچے پر ایک بار پھر انگریزی فوج سے ہماری جم کر لڑائی ہوئی۔ انگریزوں کی فوج کا مقابلہ کرنے میں سب سے زیادہ ہماری ہمت مددگار ہوا کرتی تھی اور آئین جنگ بھی۔ اسی بل بوتے پر ہم نے اوکھرول مورچہ بھی جیت لیا تھا۔ یہ جیت ایک معنی میں ہماری پچھلی جیت سے کہیں زیادہ پر عظمت اس لیے تھی کہ یہ لڑائی ہم نے ہندوستان کی سرزمین پر لڑی تھی اور پہلی بار اپنی زمین پر اپنی فتح کا پرچم لہرایا تھا۔ وہ وقت مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ ہمارے ہر ایک جوان نے لہراتے ہوئے پرچم کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ سلامی دی تھی اور قسم کھائی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم اپنے پورے ملک سے انگریزوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔

اس مورچے کی فتح کے بعد ہم نے امفال کے نزدیک جو اگلا مورچہ لیا تھا وہ تھا موئرنگ۔ یہ ۱۹۴۴ء کے شروع کے ایام تھے۔ "موئرنگ" کی سرزمین پر ہندوستانی پرچم لہرانے کی خوش قسمتی حاصل ہوئی تھی کرنل شوکت ملک کو۔ یہ فتح ہمارے تصادم کا بہت بڑا حاصل تھا۔ "موئرنگ" کی سرزمین پر "آزاد ہند فوج" کی چلنے والی اس حکومت کا اعلان لگاتار کئی دنوں تک ریڈیو ٹوکیو اور ریڈیو تاشقند کے ذریعے کیا جاتا رہا۔

موئرنگ کی فتح کے بعد

آزاد ہند فوج کے جوانوں کے حوصلے اور کامیابی کو دیکھ کر نیتاجی نے رجمنٹ کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: بہادرو! اگر تم اسی طرح ڈٹے رہے تو وہ دن دور نہیں جب لال قلعہ بھی تمہارے پرچم فتح کا بصد شوق احترام کرے گا۔ نیتاجی کی اس شیرانہ گرج نے ہماری جوانی کی رگوں میں خون کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ہمارے حوصلے بلند تھے۔ ہم جوانوں نے باہم ایک آواز میں انہیں یقین دلایا تھا، آپ جو چاہتے ہیں وہی ہمارا فرض ہے، آپ کا حکم سر آنکھوں پر ـــ

موریننگ فتح کے اس موقع پر نیتاجی نے کرنل شوکت ملک کی بہادری کو سراہتے ہوئے "آزاد ہند فوج" کی طرف سے انہیں تمغہ خاص سے معزز فرمایا تھا۔

یقیناً وہ ایک تاریخی دن تھا۔ نیتاجی کے ذریعہ دیے گئے اس پریم اور اعزاز نے ان کی شخصیت کو اہم درجہ دے دیا تھا۔ اس دن ہم جوانوں کو ایسا محسوس ہوا پہلی بار کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس اس انسان کا نام ہے جو اپنے فرض کے لیے جتنا ہمت ور، دلیر اور کٹھور ہے اپنے ساتھیوں کی ہمت اور شجاعت کو سراہنے کے لیے پیار اور محبت کے تحفے دینے میں اتنا ہی فیاض اور فراخ دل بھی ہے۔ آج بھی میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس میں قیادت کی اعلیٰ اہلیت اس درجہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ آزاد ہند فوج کے مٹھی بھر جوان، انگریز حکومت سے ہر وقت لوہا لینے کو تیار رہتے۔

رنگون مارچ ۱۹۴۴ء

رنگون کی وادیوں سے پت جھڑ کا موسم رخصت ہو چکا تھا۔ ہواؤں میں ہلکی سی خنکی، بسنت کے آنے کا پیام تھا یہ۔ موسم بے حد خوشگوار ہو چلا تھا۔ پیڑوں میں کونپلیں نکل آئی تھیں۔ موررین فتح کے بعد ہماری فوج کا حوصلہ اور زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ ٹھیک ایسے ہی وقت پر ہماری رجمنٹ جنرل شاہ نواز خاں کی قیادت میں رنگون پہنچی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہٹلر اور ممالک متحدہ کی فوجیں باہم دگر جیت کے دعوے کر رہی تھیں۔ ہماری فوج کا رنگون پہنچنا کئی معنوں میں اہمیت کا حامل تھا اور ہمارا یہ بڑا با موقع اور دانشمندانہ قدم تھا۔

رنگون پہنچتے ہی نیتاجی نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ تنہائی میں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ انہوں نے کہا تھا، ''محبوب تم آج سے میرے معتمد عساکر کا عہدہ سنبھالو گے۔ اب آزاد ہند فوج کا سارا دار و مدار تم پر ہے''!

نیتاجی سبھاش چندر بوس کا یہ حکم میرے لئے ایک دم غیر متوقع تھا۔ مجھے لگا، یک بیک میں بہت اونچائی پر کھڑا کر دیا گیا ہوں۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ مجھ جیسا ادنیٰ سپاہی اتنی بڑی عزت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ لیکن، نیتاجی کی مردم شناس آنکھیں اپنی فوج کے ہر سپاہی کو تولتی رہتی تھیں اور ان کا ہر فیصلہ یقیناً ٹھوس اور دانشورانہ ہوا کرتا تھا۔ میرا دل جذبات اور ناقابل بیان تاثرات سے لبریز ہو گیا تھا۔ نیتاجی کی عطا کردہ اتنی بڑی ذمہ داری کے جواب میں، میں اتنا ہی کہہ پایا تھا، نیتاجی آپ نے جس یقین کے ساتھ یہ عہدہ مجھے سونپا ہے میں مرتے دم تک اس کی عظمت و شان کا پاس کرتا رہوں گا۔ معتمد عساکر کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اچانک ہی کسی امتحان گاہ میں کھڑا کر دیا گیا ہوں۔ میرے لیے یہ ایک چیلنج تھا اور اب فکر یہی تھی کہ مجھے یہ امتحان پاس کرنا تھا۔

ان دنوں بطور معتمد عساکر میرا خاص کام تھا "آزاد ہند فوج" کے ذریعہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو منظم آزاد بھارت کی عارضی سرکار اور فوج کے درمیان تال میل بنائے رکھنا۔ آزاد ہند فوج کی اس عارضی سرکار کو دنیا کی نو حکومتوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان تسلیم کرنے والوں میں جرمنی، جاپان اور آئرلینڈ کی حکومتیں ممتاز تھیں۔ بطور معتمد فوجی آزاد ہند فوج کے سارے افسروں کی ترقی، تقرری اور رہائش وغیرہ سے متعلق اطلاع ناموں کو تیار کرنے سے لیکر نیتاجی کے دستخط سے مراسلے جاری کرنے تک کے امور بھی مجھے ہی دیکھنے پڑتے تھے۔

خدا کا شکر ہے کہ بطور معتمد میں نے اپنی ذمہ داری کو پوری ایمانداری سے نبھایا اور نیتاجی کی امیدوں پر کھرا اترا۔ اپنے بارے میں کچھ لکھنا یا کہنا مجھے کبھی قطعی پسند نہیں رہا لیکن اپنے انجام دیے ہوئے کاموں کا اظہار و بیان کسی عنوان سے نہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے اور ان کے سبب جو دلی مسرت تھی اسے کیوں کر پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے۔ شری کے۔ آر پالٹا نے ایک کتاب لکھی ہے" مائی اَیڈ وِنچرس ودھ آئی۔ این۔ اے"۔ شری پالٹا نے آزاد ہند فوج کی نقل و حرکت کو قریب سے دیکھا تھا اور مجھے فخر ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں میرا ذکر کرتے ہوئے بطور معتمد فوج میرے ذریعہ انجام دادہ امور کو پسند کیا ہے۔

وہ سترہ لڑکیاں

رنگون کی یاد آج بھی ایک کیفیت پیدا کرتی ہے۔ آزاد ہند فوج میں بھرتی ہونے والوں کا تانتا لگ گیا تھا۔ ہزاروں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنی زندگی آزاد ہند فوج کو سونپ دینے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ آزادی کی دیوانگی کا ایک نیا انداز تھا۔ رنگون کا وہ جوبلی ہال، اپنے سر پر کفن باندھے لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میرے خیال میں رنگون کی سرزمین نے اس سے پہلے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس دن نیتاجی سبھاش چندر بوس "جبلی ہال" میں خاص مقصد سے آنے والے تھے۔ ان کے آنے کا انتظار سبھی بڑی بیتابی سے کر رہے تھے حاضرین کی بیقرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

مجھے یاد ہے نیتاجی کے آتے ہی "نیتاجی زندہ باد" اور "جے ہند" کے نعروں سے آسمان گونجنے لگا تھا۔ لوگوں کے اس پرجوش خیر مقدم نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کا مقصد اور مشن نہایت عظیم ہے۔ نیتاجی نے اس جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "آزادی قربانی چاہتی ہے۔ آپ لوگوں نے آزادی کے لئے بہت تیاگ کیا ہے لیکن ابھی جانوں کو نذر کرنا باقی ہے۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اپنے ہاتھوں سے اپنے سروں کو کاٹ کر حصولِ آزادی کی خاطر نثار کر سکیں۔" اور آخر میں انہوں نے گرجتی ہوئی آواز میں وہ تاریخی اعلان کیا تھا "تم مجھے خون دو میں تمہیں آزادی دوں گا۔"

نیتاجی کی اس بلند آواز نے پورے ماحول کو جنون پرور بنا دیا تھا۔ ہر نوجوان ان کی یہ صدائے صورِ صفت سن کر اپنی قربانی پیش کرنے کے لیے بیتاب ہوا اٹھا تھا۔ جبلی ہال میں ہزاروں نوجوان آوازیں اس تاریخی پکار کے جواب میں گونج اٹھیں' ہم اپنا خون دینگے'' سوچتا ہوں وہ ایام وہ وقت ' وہ جوش' وہ جنون اب کیوں نہیں ؟ اچانک ایسا کیا ہوا کہ آزاد ملک کی جوانی اس قدر مرجھا گئی ہے ۔

سبھاش بابو نے" جبلی ہال" میں حاضر نوجوانوں کے آگے ایک عہد نامہ بڑھاتے ہوئے کہا تھا" آپ لوگ اس عہد نامہ پر دستخط کیجیے "

جوش سے بھرے وہ نوجوان اچانک سہم گئے ۔ ایک پل کے لیے پورا ماحول سناٹے میں آگیا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وقت اپنی رفتار بھول گیا ہو اور اس کی متحرک نبض ڈوب رہی ہو۔ لیکن محکم عزائم کے جذبوں سے بھرے ہوئے نوجوانوں کا ایک جھجک پس و پیش کی ان حدوں کو توڑ چکا تھا۔ یہ نوجوان آگے بڑھے۔ انہیں آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر نیتاجی کی للکار ایک بار پھر" جبلی ہال" میں گونج اٹھی" اس عہد نامے پر معمولی روشنائی سے دستخط نہیں کرنا ہے" " جس کی رگوں میں سچا بھارتی خون رواں ہو جسے اپنی جانوں سے چاہت نہ ہو اور جو آزادی کے لیے سب کچھ لٹانے کو تیار ہو صرف وہی سامنے آئے " نیتاجی کے ہر ارشاد کو سر آنکھوں پر رکھنے والے تیار ہو چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس عہد نامے پر دستخط کرنے کے لیے جو پہلا جتھا سامنے آیا اس میں سترہ لڑکیاں تھیں۔ وہ بے حد حیرت انگیز لمحہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان لڑکیوں نے اپنی کمروں میں کھونسی ہوئی چھریاں نکال کر اپنی انگلیاں چیر دی تھیں اور وہ عہد نامہ ان سرخ خونوں سے لالہ زار ہو گیا تھا۔ ہاں' وہ بھی ایک تاریخی دن تھا۔ آج بھی ان لڑکیوں کی جانبازی کا نقشہ آنکھوں میں رقصاں ہے ۔

سوچتا ہوں' خدایا ! مادر وطن کی آزادی کا وہ جنون اور وہ پاک جذبہ اب ہم میں کیوں نہیں رہا۔؟ پرائی دھرتی پر ان بہادر لڑکیوں کی مادر وطن کے لیے قربانی کا جذبہ دیکھ کر مجھے یقین آگیا تھا کہ ہمارے ملک کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑنے والی طاقت کو نیست و نابود ہونے سے کوئی نہیں روک سکیگا ۔

آدھی رات کے بعد

یادوں کے اس سیلاب میں ڈوبتا ابھرتا ہوا میں آج کے دن تک' آزاد ہند فوج" اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کے خیالوں سے اپنے آپ کو اگر ایک پل بھی الگ نہیں کر پایا ہوں تو یہ سب بیکار نہیں ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ زندگی کا بیتا وہ ہر لمحہ جو پوری خدائی کی صلاح و فلاح کی خاطر صرف ہوا ہو آئندہ مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ بھلا اس روشنی سے پیار کیوں نہ ہو؟ میرا یہ پیار

آج تک کی امانت ہے۔ اس امانت میں سب سے بیش قیمت نام ہے۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس۔

اس نام سے جڑی ہر یاد مجھے آج بھی ہلا ڈالتی ہے۔ لگاتار ۲۰، ۲۲ گھنٹے تک سخت محنت کرنے والے فعّال (نیتاجی) ہماری طاقت کا سرچشمہ تھے۔ اپنے دستور العمل کے مطابق دن بھر کا سارا کام نبٹانے کے بعد میں رات کو ۱۲ بجے نیتاجی کے دفتر پہنچتا تھا۔ اس وقت نیتاجی کو میں دن بھر کی کارروائیوں اور نقل و حرکت کی رپورٹ دیتا تھا پھر ان ساری رپورٹوں پر نیتاجی مجھ سے دریافت حال فرماتے، بحث و مباحثے اور مشورے ہوتے اور پھر آزاد ہند فوج کے لیے کچھ پیام پیش کرتے۔ نیتاجی کے پیامات کو میں اسی وقت فوجی دستوں میں بھجوا دیا کرتا تھا۔ نیتاجی اپنی فوج کی ساری مشکلات کو بڑے غور سے سنتے تھے اور انہیں ہر حال میں سلجھاتے تھے۔ ان کے دفتر میں فائلوں کو دیکھنے، ان پر ان کے دستخط کروانے اور انگریزوں کے خلاف نئے فوجی آئین تیار کرنے میں رات کا ایک حصہ بیت جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے عموماً ۲ بجے رات کے آس پاس ہی نیتاجی کے یہاں سے رخصت ہوا کرتا تھا کہ ہر صبح ۸ بجے تک پھر سے نیتاجی ہو کر اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔

نیتاجی مشکل سے ۳-۴ گھنٹے سوتے تھے۔ ایک بار ان کے ملازم خاص نے مجھے باتوں باتوں میں بتایا تھا ـــــــ ۲ بجے رات کو میرے وداع ہونے کے بعد بھی نیتاجی کے کمرے میں اکثر ڈیڑھ دو گھنٹے تک روشنی رہتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ ۳-۴ گھنٹے سے زیادہ آرام نہیں کرتے تھے۔ میں اس عظیم انسان کے آہنی ارادوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ آج بھی اس مردِ آہن کی یاد آتی ہے تو سر عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اپنی آزادی کے لیے دیوانگی کی حد تک ایسا دلیر انسان کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ یادوں کا سلسلہ بہت لمبا ہے، اور نیتاجی کے ساتھ گزارے ایام زندگی، ایسا معلوم ہوتا ہے ایک پوری زندگی کی طویل مدت ہے۔ رنگون! ۱۹۴۴ء! ہندوستان کے اتری حصے میں ساون، بھادوں کا مہینہ!!! رنگون کی وادیوں میں ساون کا یہ مہینہ اپنی پوری جوانی پر تھا۔ چپہ چپہ پر پھیلی ہریالی اور لگاتار ہوتی ہوئی بارش نے ایک عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ یاد ہے، وہ ایک خوفناک برسات کی رات تھی۔ لرزہ براندام کر دینے والی بجلیوں کی کڑک اور موسلا دھار بارش خوف و دہشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ رات کے ایسے ہی سناٹے میں ٹھیک بارہ بجے نیتاجی کے پیش خدمت نے مجھے اطلاع دی۔ نیتاجی نے ابھی اسی وقت مجھے اور کرنل پتری شرن رتوری کو اپنے دفتر میں یاد کیا ہے۔

حکم ملتے ہی میں اور کرنل رتوری نیتاجی کے دفتر کی طرف چل پڑے۔ وہ رات حد درجہ تاریک تھی۔

بجلی کی کڑک رہ رہ کر فضا میں دہشت پھیلا رہی تھی، تیز ہوائیں، خوفناک سناٹا اور موسلا دھار بارش سے دوچار ہوتے ہوئے ہم دونوں جلدی جلدی قدم بڑھا رہے تھے۔ نیتاجی کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے ہماری حالت عجب ہوگئی تھی، لیکن ہم نے دیکھا اس بھیانک رات میں بھی ایک یوگی کی طرح وہ انقلابی انسان اپنے کام میں مشغول ہے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی نیتاجی کی محویت ٹوٹی، وہ بے حد غور و فکر میں غلطاں تھے۔ ان کے بشرے سے لگ رہا تھا وہ اندر ہی اندر گہرے خیالات سے بڑی دیر تک متصادم رہے ہیں اور اب اس وقت ایک مضبوط اور محکم فیصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہم دونوں کے سیلوٹ (فوجی سلام) دیتے ہی نیتاجی اُٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بولے "اچھا تم آگئے" پھر پل بھر کے لیے سناٹا۔

آخر یہ سب کیسے ہوا؟

وہ ایک فیصلے کی رات تھی۔ انگریزوں سے خوف و دہشت کو ختم کرنے کے لیے نیتاجی نے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اب تک وہ اس منصوبے کا خاکہ بنا چکے تھے۔ اس خاکے کے مطابق انہوں نے ہمیں انگریزی حکومت کے خلاف اپنی فوجی تنظیم کی وضاحت کی اور پھر اسے انجام دینے کا وہ خطرناک کام مجھے اور کرنل رتوری کو سونپا۔ یہ کام اسی شب ختم کرنے کا حکم ملا تھا (گستاخی معاف، میں آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں، اس رات کے منصوبے کی تفصیل نہ دینے پر) نیتاجی کے حکم پر میں کرنل رتوری کے ساتھ اسی وقت اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا۔ وہ کالی خوفناک رات خوفناک تر ہوتی جا رہی تھی اور ہم لوگ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیقرار ہو رہے تھے۔

اس رات اپنے منصوبے کی تکمیل کے بعد ہمیں لوٹتے لوٹتے صبح کے ۵ بج چکے تھے۔ ہمیں اپنی کامیابی کی رپورٹ اسی وقت نیتاجی کو دینی تھی۔ ہم نے دیکھا اپنے دفتر کے باہر برآمدے میں نیتاجی اس وقت بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اچانک ہم دونوں کو دیکھتے ہی جیسے ان کی بے چینی کو کوئی راہ مل گئی تھی۔ ان کے چہرے کا تناؤ کم ہوگیا تھا۔ ان کا بشرہ پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ بڑی بے قراری سے پوچھا تھا "کیا ہوا؟" ہم نے اپنی کامیابی کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے نیتاجی کو اطمینان دلایا کہ ہم اس امتحان میں کھرے اترے ہیں۔ نیتاجی کا دل مسرت آگیں جذبات سے لبریز ہوگیا تھا۔ ہم دونوں کو گلے سے لگاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "تم دونوں کے جانے کے بعد سے سو نہیں سکا۔ تمہاری فکر ہر پل مجھے بے چین کیے رہی۔ لگ رہا تھا تم دونوں کو کہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

نیتاجی کی یہ سراسیمگی اور اس فیاضی نے ہم دونوں کو شرمندہ کر دیا تھا۔ ہمارے لیے ان کے اس طرح کے افکار پریشان پہلوگوں سے گہرے دلی لگاؤ کی نشاندہی کر رہے تھے اور ان کے ایسے ہی خیالات "آزاد ہند فوج" کے ہر سپاہی کے لیے یکساں تھے۔ ہر وقت جان کی قربانی دینے والے ہر فوجی کی جان کی کتنی قیمت ہوتی ہے یہ اس دن مجھے معلوم ہوا تھا اور مجھے لگا تھا نیتاجی اپنے اصولوں میں ایک سخت قسم کے فوجی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت ماں، باپ، بھائی، بہن اور دوست سبھی کچھ تھے۔ بھلا ایسے وفاکیش، مردم شناس اور عزیز ترین انسان کے ایما و اشارہ پر اپنی جان تک نذر کر دینے کے جذبے ہمارے دلوں میں کیوں نہیں متلاطم ہوتے؟ الغرض سبھی سبھاش چندر بوس کی عظیم المرتبت شخصیت کے قائل تھے۔

۱۹۴۴ء کے ماہ اگست میں ہی ہماری فوج کے کچھ بہادر جوان انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ ان جوانوں کو مانڈلے میں "آزاد ہند فوج" کے قائم کردہ شفاخانے میں پہنچایا گیا تھا۔ اس وقت کی یاد آج بھی میرے دل میں اس طرح جاگزیں ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ اسپتال کا سارا ماحول بیحد سنجیدہ ہوا اٹھا تھا۔ زخمی جوانوں میں لال سنگھ، رام پرشاد، محمد خاں اور میجر عابد حسن شفرانی کے نام مجھے آج تک یاد ہیں۔ یہ سبھی جوان بڑے جانباز تھے۔ ان کی دلیری کے قائل آزاد ہند فوج کے ڈاکٹر تک تھے۔ اسپتال کے ہر ملازم کے چہرے پر چھائی ہوئی مایوسی ہمارے جوانوں سے قلبی لگاؤ، عقیدت مندی کی نشان دہی کر رہی تھی۔ ان دلیر جوانوں کے زخمی ہونے کی خبر سن کر نیتاجی سبھاش چندر بوس مجھے اپنے ساتھ لیکر مانڈلے روانہ ہو گئے تھے۔ مانڈلے اسپتال پہنچتے ہی نیتاجی زخمی جوانوں سے ملنے کے لئے بے چین ہو اٹھے تھے۔ ڈاکٹروں کی صلاح پر انہیں اکیلے ہی اس وارڈ میں پہنچایا گیا جہاں دیش بھکت فوجی حیات و موت کی کشاکش میں مبتلا تھے۔ میں اسپتال کے دروازے پر گم سم کھڑا سوچ رہا تھا کہ ان بہادر جوانوں کو اگر کچھ ہو گیا تو ہماری فوج کا کیا ہوگا؟ ایک عجیب سے شک نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ نیتاجی وارڈ سے برآمد ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ اسپتال سے اس بنگلے تک جہاں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا، اسی دوران میں نے نیتاجی کی بے چینی کا بہت قریب سے جائزہ لیا تھا۔ انہوں نے بہت افسردہ لہجے میں کہا تھا "دیکھو ان جوانوں کا کیا ہوتا ہے"!

اس حادثے کے دو دن بعد جب میں علی الصّباح ان زخمی جوانوں کو دیکھنے اسپتال جا رہا تھا تو حیرت انگیز منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایک پل تک مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن

وہ خواب نہیں زندہ حقیقت تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے زخمی جوان رام سنگھ مسکرا رہا تھا۔ وہ ان دو دنوں کے اندر ہی چنگا ہو گیا تھا اور اس وقت وہ خود نیتاجی سے ملنے جا رہا تھا۔

اس دن تو کمال ہو گیا

مجھے دیکھتے ہی اس نے 'جے ہند' کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا تھا۔ حالانکہ وہ جسمانی طور پر کمزور ضرور تھا' لیکن اس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ میں نے اس کی خوشی بھانپ لی تھی اور اس نے جواب میں کہا تھا "اس دن تو صاحب' کمال ہو گیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہو گا۔ لیکن اس دن جو ہوا اس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ نیتاجی نے مجھے وارڈ میں گلے لگاتے ہوئے کہا تھا کہ رام سنگھ تم جلد صحت مند ہو جاؤ گے۔ میں کیا کہوں صاحب' اسی وقت سے میری تکلیف دور ہونے لگی۔ میرا جینا کارآمد ہو گیا کیوں کہ مجھ جیسے ادنی سپاہی کو بھی سبھاش بابو نے ایسی محبت سے نوازا۔ آپ ہی کہو نہ صاحب' اگر ایسے نیتا کیلئے میں جان نہیں دونگا تو پھر کس کے لیے دوں گا؟"

خدا کا شکر ہے کہ اس اسپتال میں بھرتی ہمارے تمام گھائل سپاہی دھیرے دھیرے ٹھیک ہو چلے تھے۔ سبھوں کی صحت قریب قریب اعتدال پر آ چکی تھی۔ ایک دن میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا تھا' "آپ تو کہتے تھے یہ جوان چند دنوں ہی کے مہمان ہیں' لیکن یہ سبھی تو بھلے چنگے ہو گئے۔ آخر یہ سب کیسے ہو گیا؟" حقیقت جو بھی ہو مگر اعتقاد بھی ایک بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ اسی یقین سے اس ڈاکٹر کو کہنا پڑا تھا' "نیتاجی کا پیار ان جوانوں کی زندگی بن گیا۔ نیتاجی نے جس طرح سے ان جوانوں کو گلے سے لگا کر ان کا حال پوچھا تھا' اسی ہمت کے ساتھ جوانوں نے کہا تھا' ٹھیک ہے صاحب' بالکل ٹھیک۔ دراصل' نیتاجی نے ان جوانوں میں جینے کے لئے 'وِل پاور' پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جوان اپنی موت کا مقابلہ کر سکے۔"

نیتاجی سبھاش چندر بوس کے متعلق اسی یقین نے "آزاد ہند فوج" کو وہ توانائی بخشی تھی جس کا مشاہدہ کر کے برطانوی سرکار کی آنکھوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ برطانوی فوج کے خلاف "آزاد ہند فوج" میں تیزی و چستی کی روح پھونک دینا اور فوجی تنظیم و آئین سبھی میں سبھاش چندر بابو کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر "آزاد ہند فوج" بڑی تیزی سے ابھر آئی تھی۔

سنگاپور! نیتاجی نے "آزاد ہند فوج" کی کارروائیوں کو اور تیز کرنے کی ضرورت پر کافی سوچا بچار کیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ فوج برطانوی حکومت سے براہ راست جنگ چھیڑ دے۔ ایسے میں یہ ضروری تھا کہ ہماری فوجی تیاری مکمل اور درست ہو۔ ہمارے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی! اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نیتاجی

نے جاپان سے ہتھیار خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جاپان آزاد ہند فوج کو مفت ہتھیار دینے تک کو تیار تھا۔ لیکن یہ پیش کش نیتاجی کی خودداری کو گوارہ نہ ہوئی۔ وہ آزادی کی لڑائی کسی کی دی ہوئی خیرات پر لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جاپان سے سامان جنگ و اسلحہ باقاعدہ خریدنے پر غور کر رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ ہتھیاروں کی خرید کے لیے پیسہ کہاں سے آئے۔ اس مسئلہ پر نیتاجی نے اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اس کام کے لیے عوام کا تعاون حاصل کیا جائے۔ نیتاجی کی صدائے روح پرور نے سنگاپور میں ایک عام جلسہ طلب کیا جس میں نیتاجی نے بڑی صاف گوئی سے کہا "دوستو اپنے غلام ملک ہندوستان کو آزاد کرانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انگریزی سامراج کے خلاف سیدھے اور بڑے پیمانے پر شمشیر بکف ہو کر میدان میں آجانا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے پاس اسلحہ کی کافی کمی ہے۔ اس کمی کو ہم جاپانیوں سے اسلحہ خرید کر پورا کرینگے۔ ہتھیاروں کی خریداری کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے' اس لیے دکھن پوربی ایشیا میں بسنے والے جتنے دیش پریمی لوگ ہیں خاص کر دولتمند' ان سے میری التجا ہے کہ وہ کھل کر امداد فرمائیں تاکہ میں جلد سے جلد جنگ چھیڑ دوں۔ میں توٹوٹل موبی لائی زیشن چاہتا ہوں۔"

مادرِ ہند کے نام

نیتاجی کی اس مختصر تقریر اور اعلان نے حاضرین اور سامعین پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ نیتاجی نے اپنی تقریر جاری رکھی" اس اعلان کے پہلے میرے پاس کچھ اہلِ زر آئے اور انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ نیتاجی آپ ہم سے کتنی رقم چاہتے ہیں؟ ہم اپنے کل سرمائے کا بیس فیصد آپ کو دیں یا تیس فیصد یا پچاس فیصد یا کتنا؟ میں ایسے حضرات سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب کوئی شخص میرے پاس آکر میری فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو کیا میں اس سے پوچھتا ہوں کہ تم دیش کے لیے کتنا فیصد خون دو گے؟ یہ تو ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ملک کے لیے اپنی مرضی سے جتنا ہو سکے دان دے۔"

نیتاجی کی تقریر ختم ہوتے ہوتے پورا ماحول پر جوش ہو چکا تھا۔ نیتاجی کی آواز پر سب کچھ نثار کر دینے والوں کی صف آراستہ ہو گئی تھی۔ یہ منظر میری زندگی کی نہ مٹنے والی ایک ایسی یاد ہے' جسے میں نے اپنے حافظے کے خانے میں باحتیاط رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے اس آدمی کا چہرہ اور نام ابتک یاد ہے جس نے اپنا سب کچھ آزادی کے نام پر نذر کر دیا تھا۔ وہ تھے سنگاپور میں اس وقت کے چند دولت مندوں میں سے ایک جناب حبیب صاحب جنھوں نے اپنے گھر کے سارے زیورات سبھاش بابو کے قدموں میں ڈال دیے۔ شاید انہیں اتنے سے بھی تسکین نہیں ہوئی اور پھر انہوں نے اپنا اندوختہ سرمایہ نذر کرنے کے سلسلے میں "آزاد ہند فوج" کے نام سے

چیک کاٹ کر نیتاجی کو سونپ دیا۔ حبیب صاحب نے مادر وطن کے نام پر قربانی کی خاطر اپنے خاندان کے افراد کو بھی پیش کر دیا۔ اس مجمع میں موجود تمام لوگوں نے یہ جنون اور جذبہ دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دبالی تھیں۔ مجمع نے ایک ساتھ نعرہ لگایا تھا ـــــ حبیب زندہ باد! حبیب صاحب کی اس ہمت اور دریا دلی پر نیتاجی خود حیرت میں ڈوب گئے تھے۔ انہوں نے خود آگے بڑھ کر ان کو شاباشی دی تھی۔ خدایا' ملک کی خدمت اور آزادی کا یہ پاک جذبہ کسی قوم' کسی مذہب سے کتنا بلند تھا! آج وہ سب کہاں چلا گیا؟ آزاد ہندوستان میں ہر آدمی دھڑوں میں بٹ کر کیوں رہ گیا ہے؟" ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی کے خیموں میں بٹے ہندوستان میں ہر نگاہ ایک دوسرے کو شک سے کیوں دیکھتی ہے؟ انسانی رشتوں کے درمیان تفرقے کا بیج کہاں سے آیا؟ کس نے بویا؟ میں تو یہ مانتا ہوں کہ مادر وطن کے ساتھ ہر قسم کی غداری اور بے راہ روی کا ارتکاب فوراً کورٹ مارشل کی سزا کے سوا اور کوئی دوسرا کم تر اقدام موزوں اور مناسب ہی نہیں۔

آزاد ہند فوج کو جنتا کا بھرپور پیار ملا۔ اس دن دان دینے والوں کا تانتا سا لگ گیا تھا۔ وہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا اور مجھے یاد ہے جہاں قلیل آمدنی والے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر دان دیا' وہیں اس علاقے کے کئی نامی گرامی سیٹھوں نے بھرپور رقمیں پیش کیں۔ مجھے ایسے ہی ایک گجراتی سیٹھ کا نام ابتک یاد ہے ـــــ وہ تھے شری مان بیتائی۔

سنگاپور کی جنتا نیتاجی کی شخصیت اور مشن سے گہری عقیدت رکھتی تھی۔ سنگاپور میں نیتاجی کے جنم دن کی تیاری ہو رہی تھی۔ جنم دن کے اس موقع پر ہندوستانیوں نے نیتاجی کو ترازو پر تولنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ دن بھی کم کیف انگیز نہ تھا! اپنی آزادی کے لئے پیشکش کا وہ جذبہ ناقابل فراموش ہے۔

یوم وزن شروع ہوا۔ ایک پلڑے پر نیتاجی سبھاش چندر بوس اور دوسرے پلڑے پر زیورات رکھے جانے کا سلسلہ۔ میں نے دیکھا ایک گجراتی ضعیفہ عورت نے اپنی زندگی بھر کی جمع کی ہوئی دولت' سونے کی پانچ اینٹیں بڑی بے فکری کے ساتھ ترازو پر رکھ دیں۔ اس کے بعد تو جیسے وہاں موجود عورتوں میں زیورات دان کرنے کا سلسلہ قائم ہو گیا: "انقلاب زندہ باد" کی آواز سے آسمان گونجنے لگا۔ لوگ سونے کے زیورات' موتیاں اور سکے رکھتے جا رہے تھے' لیکن ترازو کا پلڑا نہیں ہلا۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود عورتوں نے اپنے کانوں کے گوشوارے ہاتھ کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں تک اتار کر ترازو پر رکھ دیں۔

یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ایک عورت کی سسکیوں نے لوگوں کو ادھر متوجہ کر دیا۔ میں نے دیکھا

"رانی جھانسی رجمنٹ" کی کمانڈر لکشمی بائی اپنی دو ساتھیوں کے ساتھ ایک نوجوان عورت کو سہارا دے کر میزان کی طرف لا رہی تھی۔ نیتاجی یہ نظارہ دیکھ کر متحیر سے ہوئے۔ ان کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے لکشمی بائی نے بتلایا ـــــ "کل خبر آئی ہے کہ ان کے شوہر مورچے پر لڑتے ہوئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے اجل سے ہمکنار ہوئے۔" یہ سن کر نیتاجی کا دل عقیدت مندانہ جذبات سے لبریز ہوگیا۔ انہوں نے اس بہادر سپاہی کی زوجہ کے احترام میں سر سے اپنی ٹوپی اتار دی۔ اس بہادر جواں سالہ عورت نے سیندور سے بھرا ہوا اپنا "سوبھاگیہ چنہہ" (سہاگ کا وہ نشان) پلڑے پر رکھ دیا تھا۔

میں تجھے ساری پہناؤں گا

سامعین کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ وہ ہمدردی اور محبت سے بھری آزادی کی قربانی پیش کرنے والوں کا تاریخی دن تھا۔ نیتاجی نے اس جوان عورت سے کہا تھا ــــ "بہن تمہارے پاؤں کی دھول پانے کے لیے دیوتا بھی آرزومند ہوں گے۔" وزن اور عطیات کا سلسلہ جاری تھا۔ پلڑے پر ابھی اور وزن کی ضرورت تھی۔ اسی وقت ایک کافی سن رسیدہ عورت سامنے آئی تھی۔ اس کے سینے سے ایک تصویر چپکی ہوئی تھی۔ اس عورت نے رندھے ہوئے گلے سے کہا تھا۔ "یہ میرے اکلوتے بیٹے کی تصویر ہے۔ جنگ کے پہلے ہی سنگاپور میں انگریزوں نے اسے پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ کاش ایشور نے مجھے دوسرا بیٹا دیا ہوتا تو میں اسے بھی ماں کے قدموں میں نذر کر دیتی۔"

ان لمحوں کی یاد سے آج بھی میرے رونگٹے رونگٹے میں سنسنی سی بھر جاتی ہے۔ جس نے بھی وہ وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یقین مانیے اس نے اپنی زندگی کے بے حد مقدس احساسات اور تاثرات سے لطف اندوزی حاصل کی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس بزرگ عورت نے اپنے سینے سے لگی ہوئی وہ تصویر زمین پر پٹخ دی تھی۔ شیشہ چور چور ہوگیا۔ اس عورت نے تصویر میں لگی سونے کی فریم (چوکھٹا) کو پلڑے پر رکھ دیا۔ اسی وقت ترازو کا کانٹا ہلا تھا اور عطیہ میزان کے دونوں پلے برابر ہوگئے۔ سبھاش بابو جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ آزادی کے لئے ایسے جذبے اور تاثرات لوگوں کے دیکھ کر انہیں یقین آگیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا دن اب بہت دور نہیں ہے۔ انھوں نے اس دن منچ پر چڑھ کر کہا تھا: "کون کہتا ہے کہ بھارت آزاد نہیں ہوگا؟ ماں کا وردان (عطیہ) بیکار نہیں جا سکتا۔" اس اعلان کے فوراً بعد نیتا جی منچ سے اتر کر اس بزرگ عورت کے پاس آئے تھے اور جھک کر اس کے قدموں کو چھو لیا تھا۔ سبھی لوگ مہر بلب تھے۔ یہ سب غیر متوقع ہوا تھا۔ لیکن نیتاجی سبھاش چندر بوس ایک ایسی مکمل شخصیت کا نام ہے

جس میں ہزاروں خوبیاں تھیں انہیں کی یاد میری زندگی ہے۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس کی شخصیت کا ہر پہلو صد درجہ حسین اور انسانیت کے جذبوں سے لبریز تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ یاد آتا ہے جب ان کی شخصیت کی روشنی میں انسانیت نہا اٹھی تھی۔ ہاں اس دن، جب نیتاجی کا جنم دن منانے کی ہماہمی تھی یہ دور دورہ چل رہا تھا اسی وقت بھیڑ میں سے نکل کر ایک بوڑھی عورت جو پھٹے حالوں میں تھی نیتاجی کی طرف بڑھی تھی۔ ہاں مجھے اس بوڑھی عورت کا چہرہ آج تک یاد ہے۔ دھنسی دھنسی آنکھیں، کمزور جسم، محض آدھی ساری میں لپٹی ہوئی۔ اس عورت کی مفلسی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس مفلس عورت کو دیکھ کر نیتاجی فوراً اپنی کرسی پر سے اٹھ گئے۔ اس بزرگ عورت نے اپنی کمر سے کچھ پیسہ نکال کر سبھاش بابو کے سپرد کر دیے۔ پھر اس کے آگے جو کچھ ہوا وہ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ اپنے اصولوں میں ایسا سخت انسان یعنی سبھاش چندر بوس وہ ایسا جذباتی بن گیا کہ اس کی آنکھیں فوراً اشک آلود ہو گئیں تھیں۔ ان کا چہرہ لمحہ لمحہ ہول رہا تھا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندرونی بے چینی کا پتہ مل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ کشمکش کے ایک عجیب عالم میں تھے۔ انہوں نے خود آگے بڑھ کر اس مفلس مگر رحم دل بزرگ کا دان قبول کیا تھا اور اس سے کہا تھا —— "میری ماں تمہاری غریبی میری غریبی ہے۔ تمہارا دکھ میرا دکھ ہے۔ حالانکہ آج ہمارا ملک غلام ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب ہندوستان کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔ ماں اس دن میں تجھے اپنے ہاتھوں سے نئی ساری پہناؤں گا۔"

اس واقعہ کے گزر جانے کے بعد بھی سنجیدگی طاری رہی۔ حالانکہ میں نے اندازہ لگا لیا تھا پھر بھی ایک دن نیتاجی نے میرے پوچھنے پر خود بتایا تھا کہ اس عورت کو دیکھ کر وہ کس قدر کشمکش میں پڑ گئے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ اس غریب عورت کے پیسے لے لینگے تو وہ کھائے گی کیا؟ لیکن دوسرے ہی پل انہیں خیال آیا تھا کہ انکار کا مطلب ہے بوڑھی ماں کے دل کو صدمہ پہنچانا۔ انہیں محسوس ہوا تھا کہ بوڑھی ماں کہیں انہیں امیروں کا نیتا نہ سمجھ بیٹھے، کیونکہ انہوں نے امیروں سے لاکھوں روپے قبول کر لیے تھے مگر غریبوں کے چند پیسے لینے میں جھجھکنے کا مطلب تھا ان کی وطن پرستی اور قربانی کے جذبوں کی اہانت۔ نیتاجی کے اس روشن خیال نے آزاد ہند فوج کے ہر سپاہی کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ہم سبھی ان کے بلند کردار، کشادہ ظرف اور فیاضی کے مداح تھے۔ اس دن، اس واقعہ کے بعد سبھاش بابو ساری رات سو نہ سکے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور کرب نے ان کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ اس مفلس عورت نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ علی الصباح ان کا دربان میرے پاس پہنچا تھا۔ پتہ چلا نیتاجی نے مجھے فوراً بلایا ہے۔ میں بلا تاخیر تیار

ہوکر اسی وقت نیتاجی کے پاس پہنچا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا "محبوب تم آج ہی پتہ چلاؤ کہ وہ بوڑھی ماں کہاں رہتی ہے۔ اس کی سقیم حالت نے ساری رات مجھے چین نہیں لینے دیا" میرے لیے یہ ایک اور حیرت انگیز لمحہ تھا۔ میں نیتاجی کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ انسان نہیں فرشتہ ہوں۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس آدمی کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ میں نے ان کی یہ ادا بہت قریب سے اس دن دیکھی تھی۔ نیتاجی کے حکم پر میں اسی وقت اس عورت کی کھوج خبر لینے نکل پڑا تھا۔ سنگاپور کی سڑکوں اور گلیوں میں چکر لگاتے لگاتے ــــــ آخرش مجھے اس بزرگ عورت کے بارے میں کافی معلومات ہو گئی تھیں۔ میں نے نو بجے دن تک لوٹ کر نیتاجی کو اس عورت کے بارے میں مجھے کچھ معلوم ہوا تھا بتلایا۔ حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد فوراً نیتاجی نے "آزاد ہند فوج" کے کوش (بیت المال) سے اس ماں کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کر دیا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ ملک آزاد ہونے کے بعد اس عورت کے حسب رضا ہندوستان میں اس کے کہیں رہنے کا سامان کر دیا جائے گا۔ یقیناً یہ سبھاش بابو کی خود اعتمادی ہی تھی جس کے بھروسے پر انہوں نے آزادی کا خواب دیکھا تھا اور ان کے نہاں خانۂ دل کی گہرائیوں میں کہیں امید کی ایک شمع جل رہی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کسی کے روکے نہیں رک سکتی اور اس جارحیت و استحصال کے عفریت عنقریب فنا ہونے والے ہیں۔ افسوس! جب ملک آزاد ہوا اس وقت اگرچہ سبھاش بابو موجود نہیں تھے، لیکن ان کی ہر خواہش کا احترام اور اس کی تکمیل میرے لیے بمنزلۂ عبادت تھی۔ چنانچہ یہ فرض جو میرے لیے اب عبادت کا درجہ رکھتا تھا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ آزادی کے بعد اس بزرگ عورت کو میں خود سنگاپور سے ہندوستان لایا تھا۔ اس کی مرضی کے مطابق میں نے پنجاب میں اس کی رہائش کا سامان کر دیا تھا۔ اس ضعیفہ ماں کا ۱۹۵۰ء میں سرزمین پنجاب میں انتقال ہوا۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس ہندوستان کی غربت اور بدحالی کے علل و اسباب اور ساری خرابیوں کا جنہوں نے ہندیوں کو کچل دیا تھا، برٹش سامراج کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ استحصال و جارحیت کی تخم ریزی جتنی انگریزوں نے کی ہے اور استعماریت کا جو پودا انہوں نے لگایا ہے وہ اب گھنا درخت ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان کی عیارانہ چالوں سے ملک کا مالی نظام درہم برہم ہو رہا ہے اور ان کی نفع اندوزی کا بازار گرم ہے۔ انگریز اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں اور ہندوستانی عوام تباہ حال ہو رہے ہیں، گویا غریبی ان کی قسمت بن گئی تھی۔ وہ ایسے نظام کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایسی آزادی کے خواہاں تھے جہاں امیری اور غریبی

میں کوئی فرق نہ ہو۔ لیکن، افسوس ایسا نہ ہوسکا! میں ــــــ اِکھلے طور پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ ملک میں جس رفتار سے غریبی بڑھی ہے اور بڑھ رہی ہے اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان بھی اسی غیر معتدل مالی نظام کو اپنائے ہے جو غلام ہندوستان کی نمایاں علامت تھا۔ دیش کے پورے محاصلات اور سرمائے مقتدر اور مفاد پرست طبقوں کے لئے مخصوص ہوکر رہ گئے ہیں۔ دراصل، یہ ملک اسی صورت میں خوشحال اور ثروت مند ہوسکتا ہے، جب ہم سبھی ملکر سبھاش بابو کا مرتبہ منصوبہ "سمان بھومی دِرے وَستھا" اپنائیں یعنی خاص و عام کے لیے ملک کا مساوی نظام جس کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔

ہمیں خیرات نہیں چاہیئے

سبھاش بابو نے بتایا ـــــ "میں اپنے کھانے میں سے ہمیشہ دو روٹیاں بچا کر ایک بوڑھی بھکارن کو دیا کرتا تھا۔ وہ میرے اسکول کے راستے میں کھڑی رہتی تھی۔ آج جب میں روٹیاں دینے گیا تو وہ اپنی جگہ پر نہیں تھی، اس لیے اس کے حصّے کی روٹیاں یہاں رکھ دی تھیں میں ابھی وہاں گیا تھا تو پتہ چلا کہ اس بیچاری کا انتقال ہوگیا۔" سبھاش کی اس رحم دلی میں پربھاوتی (ماں) مہرِ لب رہ گئی تھیں۔ اس رات انہوں نے خوش ہوکر سبھاش کا ماتھا چوم لیا تھا۔ اندرونی تاثرات نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ آج سوچتا ہوں، وہ ماں کتنی مبارک ہوگی جس نے سبھاش جیسے لائق ترین بیٹے کو جنم دیا۔ نیتاجی کے بچپن کا یہ واقعہ یقیناً بہت پر اثر تھا۔ میں نے اس دن خود تاجیات غریبوں کی مدد کرنے کا عہد کر لیا تھا اور اسے اگر بڑا بول نہ سمجھا جائے تو آپ یقین مانیئے، ملک کی آزادی کے بعد سے آج تک ہر سال ۲۳ جنوری کو میں اپنے پیسوں سے کپڑے خرید کر غریبوں میں بانٹتا آیا ہوں اور میں نے اپنے خاندان والوں سے کہہ دیا ہے کہ میرے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

خود دار انسان اور کٹر دیش بھکت ہونے کے ناطے نیتاجی وطن کی عزت کے لیے ہر وقت تیار رہا کرتے تھے۔ ان کا ہر قدم مادرِ وطن کی آزادی کے طور، طریقے تلاش کرنے کے سلسلے میں اٹھا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ "آزاد ہند فوج" کی تنظیم کے بعد انہوں نے جرمنی اور جاپانی امداد کو بطور خیرات سمجھا اور انکار کر دیا تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ جرمنی اور جاپان انہیں ٹھیک ویسے ہی قرض دیں جیسے ایک ملک دوسرے ملک کو دیا کرتا ہے حالانکہ یہ غیر ملکی قرض بھی ان کی روح کو کربناک کرتا رہتا تھا اور یہ خیال ان کی فوجی تنظیم غیر ملکی امداد کے سہارے ہے، انہیں اکثر غم و غصّے میں مبتلا کر دیتا تھا۔ بھارت کی آزادی کے لئے چلتی ہوئی جنگ بھارتیوں ہی کے بل بوتے پر لڑی جائے اس خواہش کے زیر اثر ہی انہوں نے مشرقِ ایشیا میں بھارتیوں کو پکارا تھا۔

مشرقی ایشیا میں بھارتیوں سے حاصل شدہ امداد کے ان پیسوں کو نیتاجی نے ادائے قرض کے لیے فوراً جرمنی بھیج دیا تھا۔ جرمنی کے غیر ملکی شعبے میں "آزاد ہند تنظیم" کے ذریعے ادائے قرض کا باقاعدہ اندراج موجود ہے۔

جاپان کے ذریعۂ آزاد ہند تنظیم" کی مدد کو احسان مندی کے ساتھ منظور فرماتے ہوئے نیتاجی نے صاف طور پر کہا تھا کہ یہ تعاون ایک قرض ہے جسکی ادائیگی "آزاد ہند فوج" کی سرکار کرے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آزادی کی اس پاک جنگ میں بھی کم سے کم پیسوں کے معاملوں میں نیتاجی کسی دیش کے مقروض نہیں رہنا چاہتے تھے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہی وجہ تھی جس کے چلتے نیتاجی کے ایک اعلان پر امیر، غریب عورت، مرد، بچے، بوڑھے سبھی نے اپنا سب کچھ دان کر دیا تھا۔

نیتاجی کے بعد بھی بھارت کے اندر اور باہر نیتاجی کے دشمن انہیں جرمنی اور جاپانیوں کا تنخواہ دار قرار دینے کی اوچھی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج میں وہ پوشیدہ خط پیش کر رہا ہوں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جرمنی کے تعاون کی اصلی شکل کیا تھی اور ان معاملات پر نیتاجی کے اپنے خیالات کیا تھے، اور نیتاجی کے مخالفوں کو چیلنج دیتا ہوا یہاں میں وہ خط پیش کر رہا ہوں جسے "آزاد ہند تنظیم" کے بینکاک دفتر سے نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ہی کاری ہیکن کے جاپانی مخصوص دفتر کو لکھا تھا۔

وہ دستاویزی خط

(خفیہ)

" ایکتا۔ وشواس۔ بلیدان

آزاد ہند تنظیم (سنگھ) مکھیہ کاریالے (دفتر)

ن۔، جانسری لین اسیونان۔ بیرک، ۲۶ راگست ۱۹۴۳ء

مکھیہ کاریالے (دفتر) ہی کاری ہیکن اسیونان

جناب محترم!

شاہی، جاپانی فوجی افسروں نے ہی کاری ہیکن کی معرفت نقد اور سامان کی شکل میں جو مدد ہمیں وقتاً فوقتاً پہنچائی اور مستقبل میں بھی تعاون دینگے، اس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ اس مدد کو ایک دوست ملک کی طرف سے قرض مانا جائے، یہ ہماری تہہ دل سے خواہش ہے۔ اس قرض کو آزاد ہند سرکار وقت آنے پر ادا کریگی۔ اس لیے میں شکر گزار ہونگا کہ ہمیں جو تعاون سے نوازا جا رہا ہے اس کی تفصیلات ایک بھارتی کھاتہ جاری کر کے اس میں مندرج کر لی جائیں اور اس کا سودی حساب بھی جاری رہے۔ جب آزاد ہند کی عارضی سرکار بن جائے اور شاہی جاپانی سرکار اسے تسلیم کرلے تب مشرقی ایشیا کی "آزاد ہند تنظیم" کو دی گئی یہ مدد اس عارضی سرکار کو دی جائے جو قرض کے طور پر اسے درج کر لے، جس کی وصولی آزاد ہند

سرکار وقت آنے پر کرے گی۔ اس ضابطے کو مستحکم کر کے ہمیں مرہون منت فرمائیں گے۔

آپ کا

سبھاش چندر بوس، سبھاپتی آزاد ہند سنگھ مشرقی ایشیا"

نیتاجی نے جن وجہوں سے جرمنی چھوڑا تھا ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ جرمنی غیر ملکی شعبہ سے مالی امداد طلب کرنے میں انہیں بڑی پریشانی ہونے لگی تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ جنوبی مشرقی ایشیا میں آباد بھارتیوں سے روپئے اکٹھا کر کے رفتہ رفتہ جرمنی کا قرض چکایا جا سکتا ہے۔

آزادی کی لڑائی بے آبرو نہ ہو

آزاد ہند کی عارضی سرکار کے لیے حاصل شدہ قرض کی قسطیں چکانے کی انہوں نے تاحد امکان کوشش کی وہ جاپانی بینک کی معرفت برلن کو روپئے بھیجنا کبھی نہیں بھولے۔ غیر ملکی مدد سے انہیں بہت ٹھیس لگتی تھی۔ اپنی اسی خودداری کے چلتے انہوں نے جرمنی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جرمن آب دوز جہاز سے انہوں نے مشرقی ایشیا کا طویل بحری سفر طے کیا۔ اس میں ان کا ایک مقصد پنہاں تھا کہ وہ اس بہانے بھارت کے قریب پہنچ جائیں گے اور دوسرے یہ کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے آباد ان ہندوستانیوں کو منظم کر سکیں گے جن کے بارے میں انہیں جاپانی رپورٹ ملی تھی کہ وہ ان کی برطانیہ کے خلاف کارروائیوں کے حامی ہیں اور اس اقدام میں ان کے شریک کار ہونا چاہتے ہیں۔ نیتاجی کے دماغ میں جو منصوبہ تھا وہ بڑا ہی دور رس تھا اس کا انجام بعد میں دنیا نے دیکھا کہ انہوں نے جنوبی مشرقی ایشیا میں آباد اپنے ہم وطنوں کو منظم کر کے سنگاپور میں "آزاد ہند فوج"، کی بنا ڈالی۔ نیتاجی کے وجود سے بوکھلائے ہوئے انگریزوں نے دنیا میں یہ افواہ بھی پھیلانے کی کوشش کی تھی کہ سبھاش چندر بوس جرمنی کی کٹھ پتلی بن کر اس کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ اس خوددار آدمی نے جرمنی چھوڑ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک وطن پرست فوجی ہے اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کو کسی قیمت پر رسوا نہ ہونے دے گا۔ جرمنی چھوڑنے کے بعد سنگاپور کی سرزمین پر "آزاد ہند فوج" کی طاقت کو منظم اور با اصول بنانے میں وہ پوری طرح جٹ گئے تھے۔ اسی دوران انہیں جاپانی وزیر اعظم جنرل ٹوجو سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ ایک بہت ضروری ملاقات تھی اور اس ملاقات کے وقت نیتاجی بیحد ہوشیار تھے۔ دراصل انہوں نے اپنے جرمن قیام کے دوران یہ اچھی طرح جان لیا تھا کہ معروف جنگ بڑی طاقتیں بھارت کی آزادی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ یہ احساس انہیں ہمیشہ رہا جاپان میں جنرل ٹوجو سے بات چیت کے دوران بھی وہ مدلل باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے وزیر اعظم جنرل ٹوجو کے سامنے کھلے طور

پر اپنی شرط پیش کی کہ ان کی تنظیم جاپانی فوجی تنظیم سے بالکل الگ اور آزاد رہ کر اپنی کارروائی شروع کرے گی۔ وہ اپنی تنظیم کو کسی دیش کا نقال نہیں بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہی شرط جرمن افسروں کے سامنے بھی رکھی تھی۔ اس معاملے میں جاپانی وزیراعظم نے نیتاجی کی اس شرط سے اتفاق کیا اور یقین دلایا کہ جاپانی فوجی افسر آزاد ہند فوج کے اندرونی معاملات میں خل درمعقولات نہیں کریں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی منظور کیا کہ آزاد ہند فوج کے تنظیمی امور اور تربیتی اصول کی ساری ذمہ داری نیتاجی اور ان کے ساتھیوں پر رہے گی۔ جنرل توجو بڑے دوررس مدبّر تھے۔ انہوں نے صرف نیتاجی کے شرائط ہی نہیں قبول کیے بلکہ انہوں نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ بھارت کی خیرسگالی کے سلسلے میں وہ جو کچھ بھی بہتر سمجھیں اس پر عمل کریں۔ اس طرح جاپانی تائید حاصل کر کے نیتاجی کی جہاں حوصلہ افزائی ہوئی تھی، وہیں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک ایک قدم بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھاتے تھے۔ نیتاجی نے سب سے پہلے "آزاد ہند تنظیم" کی ایک عارضی سرکار بھی بنائی جسکی راجدھانی سنگاپور تھی۔ وہ ان دونوں تنظیموں کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ بے اختیار حکومت کے پیچھے بھی کسی جماعت کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اسکی سیاسی اور عوام الناس کے ذریعے استنادی استحکام حاصل ہوسکے۔

ہر قدم پر میل کے پتھر

اور ساتھ ہی یہ بھی کہ سبھی منظم اور منضبط ——— سرکار کا ڈھانچہ نہ ہونے پر ان لوگوں کی وفاداری اور خدمت حاصل کرنا تب تک ممکن نہیں ہے جب تک محض کسی سیاسی تنظیم کے حکم پر چلنے کے عادی نہ ہوں۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ذریعے اٹھائے گئے یہ قدم ان کی دوررس خیرسگالی اور آئین جنگ کی دانشمندی کی بہترین مثالیں ہیں۔ جنوبی۔مشرقی ایشیا کے بھارتیوں کی حوصلہ افزائی اور برما مہمات کی تیاری کر کے آسام میں برطانوی ہندی فوج سے ٹکر لینے کے منصوبوں کو اس سے بڑی طاقت ملی تھی۔ یہاں یہ صاف کر دینا بہت ضروری ہے کہ "آزاد ہند تنظیم" اور "آزاد ہند فوج" دو الگ تنظمیں ہونے کے باوجود نیتاجی کے ذریعے ملے ہوئے پیار اور یقین کے پیغام ہی تھے جنھوں نے جنوبی مغربی ایشیا کے ہندوستانیوں کو متحرک کر دیا اور اس طرح نیتاجی مقصد براری میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ ایک ایسی فوج جس کے استقرار کا دارومدار خود اس کے بل بوتے پر ہو اس میں ضابطگی اور تربیتی محاسن اور استحکام پیدا کر دینا کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا' لیکن اس روایت کو قائم رکھنے میں نیتاجی پوری طرح کامیاب ہوئے۔ حالانکہ نوجوان بھارتیوں سے "مکتی سینا" کی سخت قسم کی ڈسپلین منوانے میں ابتدائی ایام میں مشکل ضرور ہوئی' لیکن نیتاجی

یووابھارتی مانس کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے یہ اہم مسئلہ انہوں نے حل کر لیا تھا۔ تمام لوگوں کو بغیر کسی نتیجے کی امید دلائے آزاد ہند فوج کو ساتھ لیکر چلنے کی ذمہ داری نیتاجی جیسی ہمت کا انسان ہی اپنے سر لے سکتا تھا اور میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ آج تک کی ہندستان میں نیتاجی جیسی کوئی دوسری مثال پیدا نہیں ہوئی۔" جس کا نمک کھاؤ اس کا حق ادا کرو" اس پر ہندوستانیوں کا عمل درآمد ہے۔ اس سے نفسیاتی نجات دلانا بہت مشکل ہے۔ باوجود اس کے نیتاجی کہ ہندوستانی فوجیوں کو انگریز کا نمک کھانے کے عذاب سے نجات دلانی تھی۔ جس چکر کو بڑے بڑے لوگ نہیں توڑ پائے اسے نیتاجی نے آسانی سے نیست و نابود کر دیا تھا۔ آخر نیتاجی کے ذریعے "آزاد ہند" کی عارضی سرکار منظم کرنے کے بعد برما مورچے پر تعینات برطانیہ اور امریکہ کے فوجی دستوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ اس لڑائی میں "آزاد ہند فوج" کی فتح ہوئی۔ اس فتح کے بعد ہی نیتاجی کو ٹوکیو جانا پڑا۔ وہاں نومبر ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتے میں مجوزہ مشرقی ایشیا کے عظیم کانفرنس میں انہوں نے حصہ لیا۔ اسی کانفرنس کے دوران ۷، نومبر ۱۹۴۳ء کو جاپانی وزیر اعظم جنرل ٹوجو نے اعلان کیا کہ انہوں نے انڈمان نکوبار مجمع الجزائر کو "آزاد ہند" کی عارضی سرکار کو سونپ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس اعلان کے فوراً بعد عارضی سرکار نے انڈمان نکوبار مجمع الجزائر پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی ایام میں ہی جاپان نے نکوبار مجمع الجزائر کو انگریزی حکومت سے چھین لیا تھا۔ بہر حال، عارضی سرکار کی حکومت قائم ہونے کے بعد نیتاجی انڈمان گئے اور انہوں نے ان جزائر کے نئے نام "شہید" اور "سوراجیہ" رکھے۔

انڈمان جزیرے سے لوٹنے کے بعد نیتاجی ہوائی جہاز سے ہانگ کانگ چلے گئے۔ وہیں انہوں نے، "آزاد ہند فوج" کا خاص دفتر رنگون میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح "آزاد ہند فوج" کے اب دو خاص دفتر ہو گئے تھے۔ ایک رنگون میں اور دوسرا سنگاپور میں۔ دراصل، رنگون میں نیا دفتر بنانے کے پیچھے یہ منشا تھا کہ برما اور بھارت کی ملتی ہوئی سرحدیں "آزاد ہند فوج" کی لڑائی میں مددگار ثابت ہونگی اور فوج بھارت کی سرحد میں داخل ہو کر آتشِ انقلاب کی آنچ تیز کر سکیگی۔

جہاں چاہ وہاں راہ

"آزاد ہند فوج" کا صدر مقام رنگون لے جانے کے فوراً بعد فوج کی روانگی بھارت کی طرف شروع ہو گئی۔ اس دوران کئی مورچوں پر انگریزی فوج سے جم کر مقابلہ ہوا۔ نیتاجی کا یہ فیصلہ کہیں زیادہ کارگر ہوا اور نو مہینے کے اندر ہی آزاد ہند فوج کے فوجی دستے

ہندوستانی علاقوں میں گھسنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی دوران ملایا اور تھائی لینڈ میں تعینات آزاد ہند فوج کے دستوں کو برما سے ملی ہندوستانی سرحد پر بلالیا گیا۔ یہ ساری مورچہ بندی شاید آج بہت آسان لگتی ہو مگر اس وقت جبکہ ہمارے پاس محدود ذرائع تھے اور آمدورفت بہت مشکل، ساتھ ہی چاروں طرف بیہڑ علاقے، یہ سب کامیابی سے کیا جانا کم حیرت انگیز نہ تھا۔ لیکن کہتے ہیں نا، جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ نکل ہی جاتی ہے۔ آزاد ہند فوج کی آزادی کی یہ چاہت ہر راہ آسان بناتی چلی گئی تھی۔

۵ راپریل ۱۹۴۴ء! نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ذریعے آزادی کی لکھی جارہی کہانی کا ایک اور تاریخی دن۔ آج کی تاریخ کو نیتاجی نے برما کی راجدھانی رنگون میں آزاد ہند کے "اوّل قومی بینک" کا قیام کر کے دنیا کو دکھلا دیا کہ اگر حوصلہ بلند ہو تو ہر قدم پر میل کے پتھر گاڑے جاسکتے ہیں۔ قومی بینک کے قیام کے بعد فوج کا ہیڈکوارٹر سرحد کے درمیان لایا گیا، تاکہ لڑائی اور تیز کی جاسکے اور ہر نازک موقع پر مقابلہ کیا جاسکے۔

اس پوری تیاری کے ساتھ آزاد ہند فوج نے اپنی لڑائی تیز کر دی تھی۔ فوج دھیرے دھیرے ہندوستانی علاقے پر اپنا قبضہ جمانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے آزاد ہند فوج کی نجات دہندہ فوج کو امفال سے تین میل آگے ہی رک جانا پڑا۔ دراصل اب تک انگریزی فوج بھی مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکی تھی اور ہر مورچے پر اس کی گھیرابندی گہری ہوگئی تھی۔ ہماری فوج کے پاس مدد کے لیے ہوائی جہاز کی سہولت نہ تھی، نتیجتاً اسی کا فائدہ اٹھا کر لارڈ ماونٹ بیٹن کی فوج نے اپنے ہوائی حملوں سے آزاد ہند فوج کا آگے بڑھنا مشکل کر دیا تھا۔ دوسری طرف برما میں لگاتار موسلا دھار بارش نے آزاد ہند فوج کی رسد رسانی کے سلسلے میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر دیں۔ اپنی فوج کی دوطرفہ مشکل دیکھ کر نیتاجی نے پھر سے مڈبھیڑ کے ارادے کو ملتوی کر دیا تھا۔ فوج پیچھے ہٹ گئی تھی۔ یہ ایک دوررس فیصلہ تھا۔ نیتاجی چاہتے تھے کہ اس دوران نئے سرے سے امفال پر حملہ کرنے کی تیاری کی جاسکے۔

لیکن آزاد ہند فوج کے پیچھے بدقسمتی اب ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی۔

خطروں سے ہو کر گزرتے ہوئے

اسی درمیان جولائی ۱۹۴۴ء میں ہمارے بہت سارے فوجی ملیریا اور پیچش کے شکار ہوگئے۔ انہیں مورچے سے ہٹا کر مانڈلے اور رنگون کے اسپتالوں میں بھرتی کرانا پڑا۔ حالانکہ ان تمام مشکلوں سے نبٹا جاسکتا تھا اور کسی حد تک ہم نبٹ بھی رہے تھے، لیکن نجات دہندہ فوج کا پانسہ اس لئے بھی پلٹا کہ برطانوی فوج اپنی ہوائی طاقت اور مشینی سازوسامان بڑھا کر مکھتیلا میں گھس آئی

اور آخرش اسے رنگون پہنچنے میں بھی کامیابی ہوگئی۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ ہماری فوج برما سے ہٹ جائے اور پھر آزاد ہند کی عارضی سرکار کے حکم پر آزاد ہند فوج نے ۲۴/ اپریل ۱۹۴۵ء کو پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ ہماری فوج کو پیچھے ہٹنے میں لگ بھگ تین ہفتے لگ گئے۔ یہ تین ہفتے بے حد خطرناک اور سنسنی خیز تھے۔ اس دوران دشمن کے جنگی طیاروں کی گولہ باری سے ہمارے سپاہی بال بال بچے۔ بیہڑ اور جنگلی علاقوں میں کئی خطروں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزرنا پڑا تھا۔ ساری مدت موت کے خوف اور فکر میں بیتی۔ اس وقت ہر سپاہی کی زندگی تھی اور ہر وقت موت کا سامنا، مجھے اس پر فخر ہے کہ ہمارے ایک بھی فوجی کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار کا پتہ نہ تھا۔ ہم فوجی اصول اور قواعد کے ساتھ اپنا ہر قدم سوچ سمجھ کر بڑھا رہے تھے۔ آگے بڑھ کر حملہ کرنا اور پیچھے ہٹ کر بچاؤ کرنا یہ فوج کا اصل الاصول ہے، ہم اس وقت انہی حالات سے گزر رہے تھے۔

۱۹۴۵ء۔ دوسری جنگِ عظیم کے تاریخی حادثہ کا دور

مئی کے پہلے ہفتے میں جرمن فوج نے سپر رکھ دی تھی۔ جنگ بندی کی دستاویز پر جرمنی کے دستخط ہو جانے کے باوجود جاپان نے اپنی لڑائی جاری رکھی۔ دراصل جاپانیوں نے لڑائی جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ جرمنی کے سپر انداختن کے باوجود لڑتے رہے۔ اسی دوران ماہ مئی کے دوسرے ہفتے میں نیتاجی بنکاک پہنچے تھے۔ آزاد ہند فوج کے پیچھے ہٹنے کے بعد نیتاجی کا بنکاک کا سفر بڑا اہم تھا۔ وہ جرمنی کی ہزیمت کے بعد جاپان کے حالات وعزائم کا جائزہ لینا چاہتے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ جاپانیوں کے حوصلے کافی بلند ہیں۔

جون ۱۹۴۵ء! ہندوستان سے خبر آئی کہ وائسرائے لارڈ ویول عالمی جنگ کے دوران انگریزوں سے تعاون کرنے کے لیے مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی قائدین کو منانے میں لگا ہے، لارڈ ویول انگریزی چالبازی کا ہر داؤ پیچ آزما رہا ہے۔ وہ اس موقع پر بھارتی تعاون دیے جانے کے عوض اپنی مجلس عاملہ میں زیادہ سے زیادہ بھارتیوں کو شریک کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ یہ ساری خبریں چونکانے والی تھیں اور دیکھا جائے تو آزادی کی در پیش جنگ کو ٹھنڈا کرنے کا صاف منشا تھا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس نے اس مسئلہ پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا۔ وہ فوراً طیارے کے ذریعہ بنکاک سے سنگاپور پہنچے اور انہوں نے سنگاپور ریڈیو سے اپنی تقریر نشر کی۔ انہوں نے اپنی اس تقریر میں کانگریسی قائدین سے اپیل کی کہ وائسرائے کی اس تجویز کو کسی قیمت پر بھی منظور نہ کریں۔ انہوں نے مدلّل طور پر وضاحت کی کہ یہ برطانوی تجویز بھارت کے اہم موجودہ مسائل سے اقوام عالم کی توجہ ہٹانے کی ایک عیارانہ چال ہے اس سے ہندوستانیوں کی جنگ آزادی کو کسی طرح کا فیض نہیں پہنچ سکتا ہاں برطانوی مسائل اور گھریلو معاملات

جو یوماً فیوماً پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں وہ آسانی سے حل ہو جائیں گے۔ گویا اس تجویز سے سراسر برطانوی سامراج کا فائدہ ہے۔ نیتا جی نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ برطانوی سرکار کی اس تجویز میں ایک مقصد یہ بھی پنہاں ہے کہ اسی بہانے وہ آئندہ انتخاب جیت لے گی۔

تاریخ کروٹ بدل رہی تھی

دراصل نیتا جی چاہتے تھے کہ اگلے انتخاب تک اس پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے، جس سے کہیں زیادہ بہتر اور وسیع تر تجویز حاصل ہونے کی امید تھی وہ چاہتے تھے کہ کانگریس تصادم جاری رکھے تاکہ بین الاقوامی سطح پر بھارت کی پوزیشن اور نمایاں ہو۔ انہوں نے بار بار اپنی یہ اپیل دہرائی کہ جب تک برطانیہ میں چناؤ نہ ہو جائے تب تک کانگریس برطانوی تجویز سے کوئی اعتنا نہ کرے۔ سنگاپور ریڈیو سے نشر شدہ نیتا جی کی یہ تقریر کافی موثر ثابت ہوئی۔ ان کی دلیلیں اتنی زوردار تھیں کہ ان کی صداقت سے کوئی انکار نہ کر سکا اور آخر کار کانگریس نے والیسرائے کی تجویز کو ٹھکرا کر اپنی حق پرستی کا بیّن ثبوت پیش کیا۔ تاریخ بڑی تیزی سے کروٹ بدل رہی تھی۔ ساری دنیا عالمی جنگ کے دور سے گزر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں جاپان پر اس صدی کا سب سے بڑا خوفناک حادثہ ٹوٹ پڑا تھا۔ امریکہ نے ۷ راگست کی صبح ہیروشیما پر اور ۹ راگست کو ناگاساکی کو ایٹم بم کا نشانہ بنا کر انسانیت کے سارے تقاضوں کو طاق پر رکھ دیا۔ ظاہراً یہ وقت جاپان کے لیے سب سے زیادہ ابتلاو مصیبت کا تھا۔ جب کہ عین اسی وقت سوویت یونین نے بھی جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ جاپان کیلیے اب کوئی چارہ کار نہ تھا۔ آخر کار ۱۱ راگست ۱۹۴۵ء کو اسنے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

یہ وقت تھا جب آزاد ہند فوج کو نئے سر سے سوچنے بچارنے اور جنگ کی رفتار و کردار پر کڑی نظر رکھنی پڑی۔ جاپان کے سپر انداختہ ہو جانے سے نتیجتاً، ساری نقل و حرکت کو فی الحال ملتوی کر دینا پڑا۔ نیتا جی جاپان سے سنگاپور لوٹے تھے۔ سنگاپور ہی میں مجھ سے اور جنرل شاہ نواز خاں سے تادیر تبادلہ خیالات کیا تھا اور نئے حالات کی روشنی میں کچھ نئے فیصلے کیے گئے تھے۔ انہوں نے عارضی سرکار کے شہری اور فوجی احزاب کو ہدایتیں دیں اور یہ مسائل زیر غور ہوئے کہ اب آگے کیا کرنا چاہیئے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۵ء کو جاپان نے قانونی طور پر ہتھیار رکھ دیے۔

۱۷ راگست ۱۹۴۵ء یہ تاریخ آزاد ہند فوج کی تاریخ کو ایک نئے دور میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اسی دن نیتا جی سبھاش چندر بوس سیگون روانہ ہوئے تھے۔ سیگون پہنچنے کے فوراً بعد نیتا جی فارموسا چلے گئے تھے۔ نیتا جی کے اس پورے سفر کے دوران ان کے ہمسفر کرنل حبیب تھے۔

آج بھی یہ کہتے ہوئے کانپ رہا ہوں کہ کرنل حبیب سے ہماری ملاقات جن حالات میں ہوئی اور انہوں نے جو کچھ بھی بیان کیا وہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ المناک حادثہ ہے۔ کرنل حبیب سے میری ملاقات دلی کے لال قلعہ میں ایک قیدی کی شکل میں ہوئی تھی۔ دراصل اس درمیان بہت سارے وقوعات پیش آچکے تھے۔ آزاد ہند کے جوان برطانوی جنگل میں آگئے تھے۔ انہیں لال قلعے میں بطور قیدی رکھا گیا تھا۔ انہی قیدیوں میں ایک میں بھی تھا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس یعنی ہندوستان کی آزادی کا بے خوف دیوانہ' آزاد ہند فوج کا جانباز سپاہی' ہماری تمام امیدوں کا مرکز اور لاکھوں ہندوستانیوں کی آنکھوں کا خواب' اگرچہ آج ہمارے درمیان نہیں ہے' لیکن ایک لمبے عرصے کے بعد بھی اس دل شکن سچائی پر یقین نہیں آتا۔ نیتاجی ہمارے درمیان نہیں ہیں یہ خیال آج بھی اکثر و بیشتر مجھے رلا دیتا ہے۔ میری آنکھوں کی نمی گواہ ہے کہ نیتاجی کی وہ عظیم شخصیت مجھ سے اور میری زندگی سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہو پائی ہے۔ میں ہی کیا آزاد ہند فوج کا ہر ایک سپاہی نہ آج اس سچائی کو ماننے کے لیے تیار ہے' نہ اس دن ماننے کو تیار ہوا تھا جب لال قلعے کے اس زندان خانے میں کرنل حبیب نے اس صدی کے سب سے بڑے غمناک حادثے کا اظہار کیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ مجھے آج بھی یاد ہے۔

لال قلعہ میں کرنل حبیب

وہ بے حد غمگین اور صبر آزما لمحہ تھا۔ جس دن کرنل حبیب بطور قیدی دلی کے لال قلعے میں ہمارے درمیان لائے گئے تھے' اس دن ہم لوگوں نے انہیں بڑی بے تابی کے ساتھ گھیر لیا تھا۔ کرنل حبیب کی آنکھوں کی ویرانی اور اداس چہرہ حالانکہ ان کی دلی کیفیات کا غماز تھا' بہرحال ان کی زبان سے حقائق کی سماعت کے لیے ہمارا سامعہ بے چین تھا۔ میں نے ان سے پہلا سوال کیا تھا "حبیب تم تو نیتاجی کے ساتھ فارموسا میں تھے اور تم لوگ ساتھ ساتھ ڈائرین جانے والے تھے۔ پھر یہ سب... کیسے ہو گیا... کیا ہو گیا؟" اس چھوٹے سے سوال کے بعد ہی میری آواز کانپنے لگی تھی۔ وہاں موجود ہم تمام قیدیوں کی نگاہیں کرنل حبیب کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نیتاجی کے ساتھ ہم سفر کی طرح روانہ ہونے والے کرنل حبیب کے ہونٹ تھرتھرائے تھے اور لرزتی کانپتی آواز میں انہوں نے جو کچھ بھی بیان کیا تھا وہ ساری روداد میں انہی کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

۱۸ اگست ۱۹۴۵ء فارموسا کے ایک ہوٹل میں میں اور نیتاجی متصل کمروں میں ٹھہرے تھے۔ اس دن میں صبح ۵ بجے سو کر اٹھا تھا۔ آج کے دن نیتاجی تر و تازہ اور ہشاش بشاش اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ ضروری کاموں میں منہمک تھے جنہیں وہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ مجھے وہ دیکھتے ہی جیسا کہ میں نے محسوس کیا' ان کے چہرے پر اندرونی امنگوں کے آثار صاف طور پر نمایاں تھے۔ انہوں نے فوراً تیار ہو جانے کو کہا تھا۔ اس وقت ان کے چہرے کی رونق سے ظاہر ہو رہا تھا

کہ انہوں نے کسی ایسے پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے، جو آزادی کی مہم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والا ہے۔ ان کا بشرہ اس کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کے یقین نے ان کی ان کیفیات کو اور پختہ بنا دیا تھا گویا بقول شاعر ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

نیتاجی اس وقت اس شعر کی مکمل تفسیر بن گئے تھے۔ انہوں نے اس وقت مجھ سے کہا تھا ــــ "حبیب ہم دونوں آج دس بجے کی "فلائٹ" سے ڈائے رن کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ ڈائے رن پہنچ کر ہمیں روسی نیتاؤں اور فوجی افسروں سے فوراً متحد ہونا ہے"۔ نیتاجی نے بڑی گرم جوشی سے بتایا تھا ــــ "اگر ان سے میرا اتحادی معاملہ طے ہو گیا تو میرے پاس ایک ایسا منصوبہ ہے جس سے انہیں اتفاق کرنا ہی پڑے گا۔ اور تم یقین مانو حبیب، اگر روسیوں نے میرے منصوبے کو تسلیم کر لیا، تو ۲۵ر اگست تک ہندوستان میں انگریزوں کا صفایا ہو جائے گا اور لال قلعہ ہماری مٹھی میں ہوگا۔

آج اسی لال قلعے کی قید و بند میں کرنل حبیب کی آواز گونج رہی تھی: "جب میں نے نیتاجی سے اس منصوبے کی وضاحت چاہی تب انہوں نے مجھے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا "حبیب، تم میرے ساتھ ہو، صرف ۶-۷ گھنٹے جب میں روسیوں کے سامنے اپنا منصوبہ رکھوں گا تب سارے حالات سے تم۔ خود بخود واقف ہو جاؤ گے"۔ نیتاجی کا حکم پاتے ہی میں آٹھ بجے تک تیار ہو گیا۔ تقریباً ساڑھے نو بجے ہم دونوں فارموسا ہوائی اڈے پر پہنچے تھے۔

ٹھیک دس بجتے ہی ہم دونوں نے ڈائے رن روانہ ہونے والے طیارے میں اپنی اپنی جگہ لے لی تھی۔ لگ بھگ بیس منٹ بعد ہوائی جہاز کی ملازمہ (ایر ہوسٹس) نے مطلع کیا کہ جہاز اب ڈائے رن کے لیے پرواز کرے گا۔ یہ خبر سنتے ہی نیتاجی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے بیحد مسرت انگیز لہجے میں مجھ سے کہا تھا ــــ "حبیب، جس طرح ہوائی جہاز ابھی ابھی اڑنے والا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک ہفتہ بعد انگریز ہندوستان سے اڑ جائیں گے اور تب ہندوستان کی سرزمین پر اپنا پرچم لہرا اٹھے گا"۔

تاریخ کا وہ کالا ورق

اس کے بعد ہم لوگوں کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔ اس خاموشی کو توڑا طیارے کی اچانک گڑگڑاہٹ نے ہمارا طیارہ فارموسا ہوائی پٹی (RUNWAY) پر دوڑنے لگا تھا۔ طیارے پر بیٹھے ہوئے تمام مسافروں نے دم سادھ لیا تھا۔ میں نیتاجی کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا اور مستقبل کے تانے بانے بُن رہا تھا اور نیتاجی بڑے حکیمانہ اور اٹل انداز سے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

طیارہ ہوائی پٹی پر اپنی دوڑ پوری کرنے کے بعد ہوا میں اچھلا تھا۔ ایک پل کو ہماری ادھیڑ بُن کو ایک جھٹکا لگا تھا، لیکن.... لیکن دوسرے ہی پل یک بیک طیارے میں خوفناک دھماکا ہوا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہ طیارہ

فارموسا ہوائی اڈے کے قریب گر گیا تھا۔ ایک پل کے لیے میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ دوسرے ہی پل میں نے خود کو سنبھالا تھا۔ میں اس وقت بری طرح زخمی تھا۔ باوجود اس کے مجھے اپنے زخمی ہونے کی تکلیف کی بجائے اپنے عزیز نیتاجی کی فکر کہیں زیادہ تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ طیارے کا تباہ شدہ ملبہ دھائیں دھائیں تیزی سے جل رہا تھا اور بدنصیب زخمی مسافروں کی چیخ پکار سے وہاں کی فضا غم آگیں ہو رہی تھی۔ اب ہوائی اڈے کا عملہ جائے وقوع پر پہنچنے لگا تھا۔ ہم زخمیوں کو فوراً ایمبولینس میں لادا گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' نیتاجی کو ہلکی چوٹ آئی ہے باوجود اس کے وہ خطرے سے باہر تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا تھا۔ تمام زخمیوں کے ساتھ ہم دونوں کو " فارموسا ریڈ کراس اسپتال" میں پہنچایا گیا تھا۔

کرنل حبیب ایک پل کے لیے چپ ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس ہوائی حادثے کا منظر ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں رقص کرنے لگا تھا اور آواز ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک بوجھل سناٹا لال قلعہ کے اس زندان خانے میں وہ وقت کتنا بھاری گزرا تھا لفظوں میں بیان کرنا قطعی ناممکن ہے۔ اس سنجیدہ ماحول میں خود کو سنبھالتے ہوئے بھی کرنل حبیب بہت جذباتی ہوا ٹھے تھے۔ انہوں نے لرزتی آواز میں پھر بتانا شروع کیا ——— "میری لاکھ منت کے باوجود مجھے اور نیتاجی کو ایک ہی وارڈ کے ایک ہی کمرے میں نہیں رکھا گیا۔ وہاں کے قواعد و ضوابط نے میری التجاؤں کو جان بوجھ کر ٹھکرا دیا۔ آخر کار ہم دونوں کو الگ الگ کمروں میں رکھا گیا۔" یہ تھے حالات اور یہ تھے سخت مرحلے جن سے میں دوچار تھا۔ ایسے میں نیتاجی ہمارے خیالوں میں بسے ہوئے تھے۔ ہر پل میں ان کی خیریت کے لیے دست بدعا تھا۔ "فارموسا ریڈ کراس اسپتال" اس وقت کی میری بے چینی کا شاہد ہے کہ میں ہر آتے جاتے آدمی سے نیتاجی کی خیریت سننے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ اور لوگ تھے کہ کچھ بھی بولنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک ایک پل بھاری گزر رہا تھا۔ پورے اسپتال میں جیسے ایک پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قریب دو گھنٹے بعد یعنی اس وقت دن کے ڈیڑھ بجے اچانک مجھے خبر دی گئی ——— "سبھاش از نو مور" ——— اس ناگہانی قلب و جگر کو پاش پاش کر دینے والی اندوہناک خبر پر یقین نہ آیا' لیکن دوسرے ہی پل اس خبر نے جیسے مجھے بدحواس کر دیا۔ میں پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اپنے بستر سے کود کر بھاگا۔ میں کسی طرح سبھاش بابو کا آخری درشن کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس خبر نے میرے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ میرے دل و دماغ اپنے عزیز ترین قائد سبھاش بابو کیلیے ہر لمحہ بے چین تھے۔ میرے ذہنی کرب و انتشار کی کوئی حد و انتہا نہ تھی' لیکن میری ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ اسپتال کے حفاظتی اسٹاف نے مجھے دھر دبوچا اور

مجھے میرے بڈ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد میری رگ میں ایک ایسی سوئی چبھوئی گئی جس سے میرے حواس خمسہ معطل ہو گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم" یہ سب حالات بیان کرتے کرتے کرنل حبیب کی آنکھیں چھلک پڑیں گلا رندھ گیا تھا۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا — "محبوب تمہیں جان کر حیرت تو ہوگی کہ اس انجکشن کے بعد میں پانچ دنوں تک بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو سارا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ ۲۲ اگست سے ہی اعلان کیا جا رہا ہے کہ سبھاش بابو ہوائی حادثے میں ختم ہو گئے۔"

جیت وطن پرستی کی

کرنل حبیب کی آنکھوں میں ڈبڈبائے آنسو اب میری آنکھوں میں بھی اُتر آئے تھے۔ میری آواز جیسے اندر ہی اندر گھٹ گئی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ نیتاجی جیسا جیوٹ کا آدمی اس طرح اور اتنی آسانی سے ہمارا ساتھ چھوڑ دے گا۔ آزادی کا خواب دیکھنے والی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مند جائیں گی یہ ماننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم قدرت کے ہر فیصلے کے آگے لاچار ہو جایا کرتے ہیں۔ اپنے عزیز نیتاجی کے ساتھ ہوئے اس حادثے کو بہرحال تسلیم کرنا ہی تھا' سوا اس کے اور کیا چارہ کار تھا۔ کچھ بھی ہو نیتاجی کی موت تاابد حلقۂ اسرار میں بند ہو چکی تھی۔ حالات سے ابھرتے ہوئے سوالات جیسے اس وقت دنیا والوں کے سامنے تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔ کرنل حبیب کے بیان پر لال قلعے میں موجود "آزاد ہند فوج" کے تمام فوجیوں کو میں نے نیتاجی کی پرملال موت کی خبر پہنچا دی تھی۔ آہ! وہ میری زندگی کا کتنا بدقسمت دن تھا جب مجھے اپنے ساتھیوں کو نیتاجی کی موت جیسی غمناک خبر سنانی پڑی تھی۔ ہمارے تمام ساتھی اس خبر سے بُری طرح سوگوار تھے اور ان کے قلوب ہل گئے تھے۔ اس کے بعد تو جیسے ہم تمام ساتھیوں کے درمیان ایک مردنی سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ہاں' اس دن بھی کوئی اس خبر کو سچ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا اور آج کی تاریخ تک دنیا نیتاجی کی موت پر سچائی کی مہر نہیں لگا سکی ہے! سچ پوچھا جائے تو نیتاجی جیسے بے مثال ہمت والے اور آہنی ارادوں والے انسان کی موت پر کسی کو یقین آ بھی نہیں سکتا۔ دنیا اُنکی شخصیت کا لوہا مانا تھا اور ہندوستان کی آنکھیں انکی طرف بڑی امید سے لگی ہوئی تھیں۔

ایسے آدمی کی موت پر کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے بعد حالات ایک دم بدل گئے تھے۔ آزاد ہند فوج کے تمام سپاہی اگست ۴۵ء سے دسمبر ۴۵ء برطانوی فوج کے ذریعے گرفت میں لے لیے گئے اور قیدی بنا کر لائے گئے تھے۔ میری گرفتاری فارموسا میں ہوئی تھی۔ ہم تمام فوجیوں کو لال قلعے میں قید کر کے برطانوی حکومت نے طرح طرح کے ناٹک دکھائے اپنے استعمارانہ اور مطلق العنانی کے کردار کا مظاہرہ کیا۔ ان کی کرتب بازیوں کا ایک حصہ تھا بادشاہ سلامت کے خلاف خروج اور باغیانہ کارروائیوں کے

الزامات۔ ان الزامات کی اساس پر ہم پر مقدمات عائد کیے گئے۔ پھر نہ پوچھئے اپنے اقتدار کو بروئے کار لاکر کیا کچھ نہ ہوا۔ انگریزی حکومت نے ہم فوجیوں کے خلاف "کورٹ مارشل" کا زور شور سے پرچار کرنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل یہ مقدمہ "آزاد ہند فوج" کے خلاف ہندستانی عوام میں نفرت پھیلانے کی سازش کا ایک حصہ تھا۔ انگریز ہندوستانی عوام کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ عالمی جنگ کے دوران ہندوستانی سپاہیوں کے خون خرابے کی ساری ذمہ داری "آزاد ہند فوج" اور سبھاش چندر بوس کے سر ہے۔ انگریزوں کی یہ پوری کوشش رہی کہ اس مسئلے کو لے کر ہندوستانی عوام نیتاجی کے خلاف ہو جائیں۔ لیکن اس بار انگریز اپنی چال میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نیتاجی کا انداز کار اور وطن پرستی پر ہندوستانی عوام شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ہوا یہ کہ پیشاور سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے "منی پور" تک جنتا متحد رہی اور اس کے دل میں قدر و محبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ آزاد ہند فوج کے لیے۔ اسی پیار کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی قائدین بھی آزاد ہند فوج کے طرف دار بن گئے تھے۔

آزاد ہند فوج کے جوانوں پر عائد مقدمات پر پنڈت جواہر لال نہرو، بھولا بھائی ڈیسائی، آصف علی، سر تیج بہادر سپرو اور کیلاش ناتھ کاٹجو جیسے وکلا ان مقدمات کی پیروی میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" والی عیارانہ چال بری طرح ناکام ہو گئی تھی اور آخرش نیتاجی کی وطن پرستی کا جذبہ کامیاب ہوا۔ "آزاد ہند فوج" کے جن تین افسروں پر انگریزی سرکار نے سب سے پہلی مقدمے کی کارروائی شروع کی، وہ تھے جنرل شاہ نواز خاں، کرنل پریم کمار سہگل اور گربخش سنگھ ڈھلوں۔

مقدمے کے دوران انگریزی سرکار کے وکیل ان تینوں افسروں پر بار بار یہ الزام لگاتے رہے کہ انہوں نے "برٹش انڈین فوج" میں بھرتی کے وقت جو معاہدہ کیا اس کی ان لوگوں نے کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے۔

اس بھری عدالت میں

بغاوت کی سزا موت ہے۔ وہ ان افسروں کو موت کی سزا دلانے پر مصر تھے۔ لیکن سرکاری وکیل کے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے "آزاد ہند فوج" کے ان افسران نے سب کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ اس دن عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مقدمات کی کارروائی جاری تھی۔ اسی وقت جج کے سامنے ان افسران نے بے خوف اپنی مدلل بحث شروع کی تھی: "فوج میں بھرتی کے وقت ہم نے جو قسم کھائی تھی وہ ملک کی وفاداری کے لیے تھی نہ کہ شہنشاہ جارج ششم کے لیے۔ اگر ہم نے شہنشاہ کی وفاداری کے لیے قسم کھائی ہوتی تو ہم "آزاد ہند فوج" میں کبھی شامل نہیں ہوئے ہوتے۔ "آزاد ہند فوج" میں شامل ہونے کا ہمارا سیدھا مقصد تھا نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ساتھ وفاداری اور نیتاجی کے ساتھ وفاداری کا مطلب

ہے انگریزی حکومت کا سرزمین ہند سے صفایا" اس بیان سے عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ وہاں موجود لوگوں نے ان فوجیوں کو بڑی حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

اس وقت جہاں انگریزوں نے اس بیان پر تیکھی تنقید کی وہیں لال قلعہ میں موجود کئی انگریز سپاہیوں نے شاباشی دیتے ہوئے کہا تھا "بھائی تمہاری بہادری پر ہمیں بھی فخر ہے۔ اگر ہم بھی تمہاری جگہ ہوتے تو دیش کے لیے یہی لڑتے۔ دیش کے لیے لڑنا کوئی جرم نہیں ہے"

ان انگریز سپاہیوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے کلماتِ حق کے اظہار کا شاہد صرف میں ہی نہیں ہوں بلکہ کیپٹن رام سنگھ اور کرنل شفرانی بھی اس بیان کے چشم دید شاہد ہیں۔ اس کے اظہار کا مقصد بس اتنا ہی ہے کہ وطن کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کے خلاف صرف انگریزی حکومت تھی، بلکہ اس سے متحد جو سیاسی عناصر تھے رفتہ رفتہ وہ بھی ماننے لگے تھے کہ ہندوستان اب بہت دنوں تک انگریزوں کے قبضے میں نہیں رہ سکے گا۔ جنرل شاہ نواز خاں، کرنل پریم کمار سہگل اور گربخش سنگھ ڈھلون کے خلاف جاری مقدمات کی آزاد ہند فوج کی طرف سے بھولا بھائی ڈیسائی پیروی کر رہے تھے۔ ان تینوں افسروں کے خلاف سرکاری وکیل نے بہت ساری شہادتیں اور ثبوت اکٹھے کر لیے تھے۔ قلعے کے اس زندان خانے سے ایسا لگتا تھا کہ ان افسروں کی خلاصی ممکن نہیں ہے، لیکن بھولا بھائی ڈیسائی پوری طرح کوشاں تھے اور آخر کار انہوں نے اس قلعہ بندی میں وہ سوراخ ڈھونڈ کر رکھ دیا (اپنی قانونی موشگافیوں سے مقدمات کی سنگینی کو ہلکا کر دیا)۔

میں یہ مانتا ہوں کہ تحریک آزادی کی تاریخ یا تو یکطرفہ ہو کر رہ گئی ہے یا پھر اسکے ساتھ زیادتیاں یا ناانصافی کی گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "آزاد ہند فوج" کی تحریک آزادی میں پیش کردہ دیباچہ کا صحیح تخمینہ کرنے کے بجائے غلط فہمیاں پھیلانے کی زیادہ کوشش کی گئی۔ ایسی ہر کوشش جہاں تاریخ کے ساتھ غیر مورخانہ حرکت کی گئی ہے، وہیں آنے والی نسلوں کے ساتھ ایک گہری سازش بھی۔ میں مورخین سے بڑی نرمی کے ساتھ یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اس وقت کے حالات اور "آزاد ہند فوج" کے طرز عمل یا پالیسی کے درمیان غیر ملکی مدد جیسا لفظ کیوں اور کہاں سے آیا ہے؟

حکومت کے خلاف طوفان

آئیے "آزاد ہند فوج" پر عائد مقدمے کے ذکر کے پس منظر میں اس سوال کے دھندلکے میں الجھے جواب کی تلاش کر لیں۔ میں موجودہ نسل کے سامنے وہ صداقت صاف صاف رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں، تاکہ وہ خود کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔

دراصل انگریزی حکومت کے ذریعہ عائد کردہ یہ مقدمہ سلطنت دشمنی اور ہند۔ برطانوی فوجی بغاوت جیسے الزام پر مبنی تھا۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں "آزاد ہند فوج" کی طرف سے یہ مقدمہ بھولا بھائی ڈیسائی لڑ رہے تھے۔ انہوں نے تمام حالات اور انگریزی حکومت کی دلیلوں کی گہری چھان بین کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے کہ ۸ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان کی چھڑی ہوئی لڑائی سے مشرقی ایشیا کے بھارتیوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ جاپان فتح پر فتح حاصل کرتا گیا۔ فروری تک سنگاپور میں انگریزوں کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستانی سپاہی جاپانیوں کے قیدی بن گئے۔ ان ہندوستانی سپاہیوں کا سالار تھا کرنل ہنٹ۔ کرنل ہنٹ نے جاپان کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کھلے عام اعلان کیا تھا کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اسی طرح سے جاپانیوں کا حکم ماننا چاہیے جیسے انگریزوں کا حکم مانتے تھے۔

اپنی پیروی کے دوران بھولا بھائی نے انہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دلیل پیش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا جب ہندوستانی سپاہی جاپانیوں کے ہاتھ سونپ دیے گئے اور انہیں جاپانیوں کا حکم ماننے کی ہدایت دی گئی تب ان پر انگریزی حکومت سے وعدہ خلافی کا جرم کہاں عائد ہوتا ہے؟

شری ڈیسائی نے اپنی دلیل میں ایک اور اضافہ یہ کیا کہ کرنل کے ہتھیار ڈال دینے کا یہ مطلب بھی تھا کہ سپاہیوں پر سے ہر طرح کی نگرانی ختم کر دی گئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہندوستانی سپاہیوں نے جاپانی فوج کی طرف سے کام کیا تو بین الاقوامی قانون کی نظر سے وہ غلط کیسے ثابت ہوتے ہیں؟

وکیل بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنے تمام دلائل میں صرف قانون کا سہارا لیا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ہر وطن پرست کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی آزادی حاصل کرے اور اس طرح وطن پرستی کے جذبے کو جرم کے کٹہرے میں نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔ انہوں نے حالات کا خلاصہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت "آزاد ہند سرکار" ان سبھی شرطوں کو پورا کرتی ہے جو ایک آزاد ملک پر لاگو ہوتا ہے۔ آزاد ہند سرکار کے تحت تقریباً بیس لاکھ شہری ایک ملک اور ایک خیال پر متفق تھے۔ اس سرکار کے زیر حکم تمام شعبے اور اس کی فوج کسی بھی طرح غیر قانونی نہیں مانی جا سکتی۔ انہوں نے کہا کہ پندرہ ورگ میل حلقے میں قائم "آزاد ہند سرکار" کی حکومت کو نظرانداز کیا جا سکتا۔ اس سرکار کے سپاہی کسی دھمکی یا لالچ کے تحت غیر ملکی فوج کا ساتھ دے رہے تھے جیسے الزام کو انہوں نے محض بے بنیاد ٹھہرایا۔ انگریزی حکومت کے تحت ملازمت کے فرائض انجام دینے والا جج ایسی کسی بھی دلیل کو آسانی سے نہیں مانے گا یہ طے تھا۔ پھر بھی وکیل بھولا بھائی ڈیسائی نے "آزاد ہند فوج" کی تصویر کو دنیا کے سامنے بڑی بڑی صفائی سے رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ صداقت کا قد کبھی کوتاہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس پورے معاملے کے سامنے انگریزی حکومت ضرور کوتاہ قامت ہو گئی ہے۔

انگریز جج کی اس عدالت نے تمام قوانین طاق پر رکھ کر "آزاد ہند فوج" کے ان تین جانباز افسروں کو جیل کی سزا دے دی تھی۔

"آزاد ہند فوج" کے افسروں کی یہ سزا دہندگی آخر کار انگریز حکومت کو بڑی مہنگی پڑی۔ جب ملک کی آزادی کے لیے جوانوں نے سر سے کفن باندھ لیا تھا، تب ان کے آگے زندگی کے کوئی معنی نہ تھے۔ غالباً یہ بات انگریز نہیں سمجھ پائے اور ہوا یہ کہ ان کی ہر چال ان ہی کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ ان جوانوں کی سزا کا انجام یہ ہوا کہ سارا ملک چراغ پا ہو اٹھا اور انگریزی حکومت کے خلاف طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

۴۲ء کی تحریک دبا دیے جانے کی وجہ سے جنتا میں جو مایوسی پھیل ہوئی تھی، اسے ان افسروں کے فیصلۂ سزا نے یک بیک جھٹک دیا اور ہوا یہ کہ ملک کی آزادی کے لیے ایک بار پھر زوردار فضا تیار ہو گئی۔ عوام نے اس سزا کو سراسر بے انصافی پر محمول کیا بلکہ انگریزوں کے جذبۂ انتقام کو اچھی طرح بھانپ لیا۔ چنانچہ ملک میں انقلابی تحریک کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ انگریزی سامراج کی روح فنا ہو گئی۔

وہ دن بھی دور نہیں

حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ برطانوی فوج کے بھارتی جوان بھی بغاوت کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ حکومت کو اپنے خفیہ طریقوں سے یہ خبر مل چکی تھی کہ فوج کے بھارتی جوان اب انگریزی حکومت کی جانب سے لڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ فوج پر سے اپنی گرفت ڈھیلی ہوتی دیکھ کر ہی انگریزی سرکار نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ دن قریب آ گیا ہے کہ سرزمین ہند پر ان کا آفتابِ اقبال غروب ہو جائے گا۔ عوام کی سرکشی اور بیداری کو دیکھ کر سرکار کو "آزاد ہند فوج" کے ان تین نوجوانوں کی رہائی کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔ ان تین جوانوں کی رہائی سے جہاں سارے ملک میں ایک نیا جوش پیدا ہوا، وہیں وکیل بھولا بھائی ڈیسائی کی خوشی کی حد نہ تھی۔ ایسے وقت میں شری ڈیسائی بہت یاد آئے اور ان کی وہ باتیں یاد آئیں کہ ان جوانوں کو بچانے سے کہیں زیادہ اہم ہے نیتاجی سبھاش چندر بوس اور "آزاد ہند فوج" کی عزت کا تحفظ۔ نیتاجی سے اس محبت اور ایسی عقیدت کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

جنرل شاہ نواز خاں، کرنل پریم کمار سہگل اور گربخش سنگھ ڈھلوں کی رہائی کے بعد جگہ جگہ پر جلسے کیے گئے۔ اس سلسلے میں دہلی میں منعقد جلسۂ عام میں ان تینوں جوانوں کو دیکھنے سننے کے لیے لاکھوں کی بھیڑ امڈ پڑی تھی۔ اس جلسے کے بارے میں بتایا گیا کہ ایسی بھیڑ اور اس قدر مشتاق آنکھیں تا آں دم کسی عظیم ترین نیتا کے لیے بھی مجتمع نہیں ہوئیں تھیں۔ ایسا خود پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ملاقات کے دوران لال قلعہ میں مجھ سے کہا تھا۔ جی ہاں! کچھ عجیب منظر تھا! اس وقت میرے علاوہ کرنل حبیب اور کیپٹن رام سنگھ بھی موجود تھے۔ دہلی میں اس تاریخی جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے

ان جوانوں نے کہا تھا: "یہ ہماری خوش بختی تھی کہ اپنے محبوب نیتا کی قیادت میں انگریزوں کی مضبوط اور منظم سامراجی طاقت سے دوبدو مقابلہ کیا، ہمیں اس پر مدت العمر فخر رہے گا۔ ان کی ہمت، پرجوش ولولے اور آہنی جنگ کی بے نظیر صلاحیت کی بدولت "آزاد ہند فوج" نے مورینگ، اوہرول، چین، ہل ہاکا کے ساتھ اور بھی کئی مقامات پر پہلی بار ہندوستانی پرچم لہرایا اور آپ یقین مانئے، اب وہ دن بھی دور نہیں جب ہم لال قلعہ پر بھی ہندوستانی پرچم لہراتا ہوا دیکھیں گے۔ حالانکہ اس وقت ہمارے محبوب قائد و رہنما نیتاجی نہ ہوں گے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ آزاد ہندوستان ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا اور اسی طرح کی ایکتا قائم رہے گی جس طرح کی ایکتا نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ہم فوجیوں اور عام جنتا کے درمیان قائم کر رکھی تھی۔" اس عظیم الشان جلسۂ عام کے ختم ہوتے ہوتے تک لوگوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

کس جنگل میں کھو گیا وہ راستہ

"سبھاش زندہ باد" اور "لال قلعہ ہماری مٹھی میں" کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا تھا۔ لوگوں نے ان تینوں افسروں کو اپنی گود میں اٹھا کر اپنے جوشِ محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت کا وہ جوش جنوں اور آزاد ہندوستان کا تصور آج کیوں دھندلا ہو گیا؟ کس جنگل میں کھو گیا وہ راستہ جسے نیتاجی سبھاش چندر بوس نے دکھایا تھا اور جس پر چل کر ایک نیا ہندوستان قائم کرنے کا عزم کیا تھا ہم نے۔ میں، آج اپنے ملک کے نوجوانوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے یقیناً اپنے گوشۂ دل میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی مقدس یاد کو جگہ دے رکھی ہے یا انہیں بھول گئے؟ میرے نوجوان دوستو تاریخ کی آنکھیں چرا کر پہلو بچانا بزدلی ہے۔ ہندوستان ایک غیرت مند ملک ہے، جانبازوں کا وطن ہے یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ ایمانداری، وفاشعاری اور شجاعت کی ایسی ایسی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں دیکھ کر غیر ملک والے انگشت بدنداں رہ گئے ہیں۔ پھر آج ایسا سناٹا کیوں ہے؟ ایسی اداسی کیوں ہے؟ اے کاش کوئی اسکا جواب دیتا!!

ماہ اگست ۱۹۴۵ء کی بات ہے جنرل شاہ نواز خاں، کرنل پریم کمار سہگل اور گر بخش سنگھ ڈھلون کی رہائی کے وقت میں لال قلعہ میں انگریزی حکومت کا قیدی تھا اور اس زندان خانہ میں مجھے باہر ہونے والے وقوعات و حالات کی خبر مل جایا کرتی تھی۔ یہ جان کر تعجب ہو گا کہ مجھے بیرونی دنیا کی تمام خبریں پہنچانے والا اسی جیل خانے کا ایک انگریز سپاہی ہوا کرتا تھا۔ میں اسی سپاہی کی اس مدد پر خود حیرت میں تھا۔ ——————— ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا: "بھئی" تم مجھ پر اتنی مہربانی کیوں کر رہے ہو۔ اس انگریز سپاہی نے جس انداز سے مجھے جواب دیا تھا اس سے میرا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ آئی ہیلپ یو ڈیو ٹو ورنگ پرسنیلٹی آف یور لیڈر "سبھاش چندر بوس" اس دن مجھے لگا تھا کہ واقعی بہادری ایک ایسی صفت ہے جس کی قدر ملکی اور غیر ملکی ہر سپاہی کے دل

میں ہوتی ہے ——————— اسی انگریز سپاہی نے مجھے بتایا تھا "مسٹر محبوب، شاہ نواز خاں، پریم کمار سہگل اور گربخش سنگھ ڈھلوں کی قسمت کا فیصلہ تو ہو گیا لیکن یہ سننے میں آ رہا ہے کہ سرکار اب تمہارا کیس ٹیک اپ کرنے جا رہی ہے۔ جلد ہی تمہارا "ٹرائل" شروع ہونے والا ہے۔"

ہاں! اس انگریز سپاہی کی پیش کردہ اطلاع میں سچائی تھی۔ واقعی اس اطلاع کے ٹھیک دوسرے دن میری اور کچھ دوسرے سپاہیوں کی باقاعدہ پیشی ہوئی اور مقدمہ شروع ہو گیا تھا۔

ٹرائل کے ساتھ ہی وکیلوں کی مجھ سے جرح شروع ہوئی اور پوچھ تاچھ جاری ہو گئی تھی۔ ———————

مجھ سے سوالات پنجاب پولیس کے دو ممتاز افسر کر رہے تھے۔ اپنے وقت کے وہ بڑے متشدد پولیس افسر لال قلعہ کے پولیس چیمبر میں ۲۱ دنوں تک مجھ سے استفسارِ حال کرتے رہے۔ ان کے پوچھ تاچھ کے طریقے کچھ ایسے تھے جن سے ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے دو ہی سوال کرتے تھے ایک یہ کہ دان میں نیتاجی کو جو زیورات اور روپے ملے، وہ کدھر گئے اور دوسرا یہ کہ ربر پلینٹیشن میں کام کرنے والے قلیوں کو سبھاش بابو نے اتنا بہادر سپاہی کیسے بنا دیا؟ کیا وجہ تھی کہ ان کی ایک آواز پر ہر طبقے کے لوگ "آزاد ہند فوج" میں چلے گئے؟ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ربر پلینٹیشن میں کام کرنے والے قلی وہ لوگ تھے جو بھارت کے جنوبی صوبوں سے ملایا اور سنگاپور لائے گئے تھے۔ ان قلیوں کی اوسط عمر محض اٹھائیس[۲۸] — انتیس[۲۹] سال تھی۔ یہ قلی ناٹے قد کے جسمانی طور پر بیحد کمزور ہوا کرتے تھے۔ غلامی سے چھٹکارا پانے کا جذبہ ان کے اندر ایک نئی طاقت کو جنم دے گیا تھا اور یہ طاقت نیتاجی سبھاش چندر بوس کی دور رسی اور پیار کی وجہ سے پروان چڑھی تھی۔ ان کی بہادری پر نیتاجی نے انہیں 'بہادر وطن پرست' سے موسوم کرتے ہوئے معزز کیا تھا۔ ان قلیوں نے بھی خود منظور کیا تھا۔ یہ نیتاجی کی لیڈر شپ کی کوالٹی کا کمال ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی نے ہم جیسے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ اب تو ہم انگریز سرکار کی چولیں تک ہلا دیں گے" انہی بہادر وطن پرستوں کو مجھ سے بار بار پوچھا جاتا رہا اور لگاتار ۲۹ دنوں تک ہمیں لاجواب اور شکست خوردہ بنا ڈالنے کی کوشش جاری رہی۔ پوچھ تاچھ کی اس مدت میں میری خاموشی ان پولیس افسروں کو ایک سبق دے گئی۔ میرے مسلسل انکار پر ایک پولیس افسر رائے بہادر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا —— اے آزاد ہند کے سپاہی محبوب، شاید تم مجھے نہیں جانتے کہ میں، رائے بہادر ہوں جس کی انگریزی حکومت میں کتنی عزت ہے، دھاک ہے۔ شاید تم یہ بھی نہیں جانتے کہ اسمبلی میں بم پھینکنے والے بھگت سنگھ کو میں نے ہی گرفتار کیا تھا۔ میں وہ شخص ہوں،

جس نے تمہارے جیسے نہ معلوم کتنے انقلابیوں اور باغی جوانوں کی ہیکڑی ختم کردی ہے۔ تم بھی نمک حرام ہو۔ اس افسر نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا تھا۔ جس کا نمک کھاؤ اس کا حق بھی ادا کرو۔ میں نے انگریزوں کا نمک کھایا ہے، اس کا حق ادا کر رہا ہوں۔ اگر تم اب بھی منہ نہیں کھولنا چاہتے تو سن لو کہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ جانتے ہو انگریزی حکومت تمہیں نیست و نابود کر دے گی!

حکومت کی گہری چال

"یہ تمہاری ماں، بہن اور پورے خاندان کو تباہ کر سکتی ہے۔ اس دھمکی کے اثرات مجھ پر مرتب ہونے کی امید میں وہ ایک پل کو رکا تھا۔ مجھے حسب سابق اٹل اور اپنے موقف پر محکم دیکھ کر وہ غیظ میں کھول گیا تھا۔ اس نے اپنا آخری تیر مجھ پر چلایا تھا۔" خیر تم کچھ نہ بتاؤ لیکن تمہارے کمانڈر جنرل شاہ نواز خاں نے سب کچھ اگل دیا ہے۔" "میں نے بڑی صفائی سے شاہ نواز کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ یہی وجہ ہے اسے موت کی سزا نہیں ہوئی۔ اسے موت کے منہ میں جانے سے بچانے والا میں ہی ہوں"

جنرل شاہ نواز خاں کے بارے میں یہ جان کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ اس رات جیل کی اس کوٹھری میں ایک پل بھی نہ سو سکا۔ ساری رات بے چینی میں کٹی اور اس دوران مجھے صرف ایک ہی سوال چین نہ لینے دے رہا تھا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ جنرل شاہ نواز جیسا وطن پرست فوجی کہیں ایسی غداری کر سکتا ہے؟ جس فوجی پر ہمارے عظیم نیتاجی کو سب سے زیادہ فخر تھا، کیا وہی نیتاجی کی روح کو اس قدر تکلیف پہنچا سکتا ہے؟ اسی ادھیڑ بن میں رات گزرتی چلی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اچانک تقریباً صبح ۴ بجے جیسے مجھے کوئی ــــ الہام سا ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ یہ سب ایک دھوکا ہے، محض من گھڑت کہانی:۔ اس کے پیچھے چھپی ہوئی حکومت کی گہری چال کا خیال آتے ہی میں کانپ اٹھا: مجھے ایسا لگا حکومت جنرل شاہ نواز خاں کا حوالہ دے کر مجھے ورغلانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ میں دب کر اپنے نیتاجی اور "آزاد ہند فوج" سے متعلق قابلِ اخفا اور اہم معلومات اگل دوں اور حکومت کی شرمناک چال کامیاب ہو جائے۔

میں نے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کی۔ اول جلول خیالوں کو جھٹکتا ہوا میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اگر ان افسروں نے یہ بات پھر دہرائی تو میں انہیں دندان شکن جواب دوں گا۔" تم سبھی جھوٹے ہو اور جھوٹ میں مجھے پھانسنا چاہتے ہو۔" لیکن میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں!" "میں ایک وطن پرست فوجی اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کا شاگرد ہوں۔" لیجیے پھر وہی ہوا! اگلی پوچھ تاچھ کے دوران اس پولیس افسر رائے بہادر نے جنرل شاہ نواز والی بات کا اعادہ کیا۔ یہ سنتے ہی مجھے یارائے صبر نہ رہا۔ میں نے جواب دیا" "رائے صاحب! اگر آپ یہ سوچتے ہوں کہ

ہیں آپ کے دامِ تزویر میں پھنس جاؤں گا' تو یہ آپ کی سادہ لوحی ہے یا خام خیالی! آزاد ہند فوج میں بھرتی کے وقت میں نے جو قسم کھائی تھی وہ کوئی کمزور دھاگا نہیں جو آپ جیسے لوگوں کے جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ مجھے تو آپ کے ہندوستانی ہونے میں بھی شک ہے۔" میرے اس جواب سے اس پولیس افسر کا بوکھلانا لازم تھا۔ اس نے میرے ساتھ جو زیادتیاں کیں، یہاں ان کا ذکر کر کے میں کسی ہمدردی کا خواہاں نہیں۔ بہرحال —— رائے بہادر کی زیادتیوں سے چھٹکارا ملتے ہی میں دوسرے پولیس افسر کے ہتھے چڑھ گیا۔ دماغ پر زور ڈالنے کے باوجود اس دوسرے پولیس افسر کا نام ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آرہا ہے۔ یہ کوئی مسلم پولیس افسر تھا' اس نے بھی گھما پھرا کر مجھ سے وہی سوالات کیے' جو رائے بہادر نے کیے تھے۔ میں نے ہر بار اپنا ایک ہی جواب دہرایا تھا۔ ایک دن اس افسر نے مجھ سے کہا تھا: "محبوب تم تو ایک دم کمسن نوجوان ہو، جب تم "برٹش انڈین فوج" میں بھرتی ہوئے تو اس وقت تمہاری رجمنٹ سب سے زیادہ جنگجو اور بہادری کے لیے مشہور تھی۔ تب تم سرکاری فوج چھوڑ کر "آزاد ہند فوج" میں کیوں چلے گئے؟ تم ایک بہادر سپاہی ہو" تمہاری بہادری سے "برٹش انڈین فوج" کا نام روشن ہوتا اور برٹش سرکار تمہیں اونچے عہدوں پر فائز کرتی۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ سبھاش چندر بوس ہی کی وجہ سے بے شمار ہندوستانی سپاہی مارے گئے؟" اس افسر نے اپنی بات پر بشدت زور دیتے ہوئے مجھے متنبہ کیا ——

"میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں۔ میرے اور رائے بہادر کے سوالوں کا جواب دیدو۔ حکومت تمہیں سر آنکھوں پر بیٹھالے گی۔"

سر زمین پر اپنا پرچم لہرائے گا

اس افسر کی باتیں سنتے ہی میں طیش میں آگیا۔ میرا خون ابلنے لگا اور میں گرج پڑا —— "کیا آپ آزاد ہند فوج والوں سے اس بات کی امید کرتے ہیں، کہ وہ انگریزی فوج کے ساتھ مل کر ملایا' برما' سنگاپور' تھائی لینڈ' انڈونیشیا جیسے ملکوں میں جا کر ان پر ستم توڑیں' زیادتیاں کریں اور وہاں کے لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑیں تاکہ گورے چمڑے کے لوگ ان پر حکومت کر سکیں؟

"آپ اطمینان رکھیں، مجھ سے آزاد ہند فوج کے بارے میں کوئی واقفیت آپ کو نہیں مل سکتی' آپ ہماری جان ہی کیوں نہ لیں ہمیں پرواہ نہیں! عالم جنون و ناگواری میں میں نے جو کچھ کہا اسے سن کر یہ پولیس افسر حیرت میں ڈوب گیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف پچیس۲۵ سال تھی۔ یقیناً میرا خون گرم تھا اور حوصلہ بلند۔ اس طرح جان ہتھیلی پر رکھ لینے کے بعد کسی طرح کا کوئی خوف باقی نہیں رہ جاتا ——

چنانچہ میں اس دم بے خوف تھا اور انجام سے بے نیاز! شاید میری کمسنی' شباب کے ولولوں اور

بلند حوصلوں کو دیکھ کر اس پولیس افسر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اور غیر متوقع طور پر اس نے کہا تھا۔ "آئی کین بی این ایڈ مائرر آف مسٹر سبھاش چندر بوس اینڈ ایٹ دی سیم ٹائم اے گڈ انگلش مین" ایک ہی ساتھ میں سبھاش چندر بوس کا مداح اور ایک لائق انگریز کا بھی) جاتے جاتے اس پولیس افسر نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی ——— محبوب' میں نے جو کچھ بھی کہا وہ سب میرے دل میں بہت دنوں سے مضمر تھا۔ میں برطانوی سرکار کا ایک ملازم ہوں' اس لئے یہ سب آزادانہ طور پر نہیں کہہ سکتا تھا۔ تم جیسے جوانوں کی ہمت اور وطن پرستی کے جذبوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انگریز اس ملک میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکتے۔ ہندوستان کی سرزمین پر اب اپنا پرچم لہرائے گا۔ یقیناً' تمہارے نیتاجی کی طرح کا "آرگنائزر" ہیں نے اب تک نہ کہیں دیکھا نہ سنا" یہ پولیس افسر اس دن مجھ سے پوچھ تاچھ کے دوران میرے ساتھ تقریباً چار گھنٹے تک رہا۔ اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ہمارے معزز قائد نیتاجی کے خوف نے کس قدر انگریزی سرکار کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ نیتاجی کی طاقت نے' وہ حکومت جس کے دور میں آفتاب غروب نہیں ہوتا، اس کی راجدھانی لندن کو زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ انگلینڈ کا بچہ بچہ سبھاش چندر بوس کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ بہر حال آئے دن کی پوچھ تاچھ اور دماغی کوفت سے نجات کے بعد میرا مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ میرے کیس کی پیروی بھی انہی وکیلوں نے کی' جنہوں نے جنرل شاہ نواز خاں' کرنل پریم کمار سہگل اور گر بخش سنگھ ڈھلون کی پیروی کی تھی۔ خاص وکیل بھولا بھائی ڈیسائی کی لاکھ صفائی اور دلیلوں کے باوجود انگریزی حکومت نے مجھے جیل کی سزا دیدی۔ یہ ایک طے شدہ فیصلہ تھا اور مجھے اس فیصلے کا انتظار تھا۔ ویسے شعوری طور پر تو میں جانتا تھا کہ عدالت قانون اور مقدمے کا یہ سارا ناٹک انگریزی حکومت نے دنیا کو دکھانے کے لئے کیا ہے۔ دراصل اس کی نیت ہندوستانی عوام میں پھوٹ ڈالنے کی تھی' جو آخر کار ناکام ہو گئی۔

ذرا دیر ٹھہر کر

انگریزی قانونی عدالت میں جتنی دھاندلیاں ہو رہی تھیں ان کی قلعی کھولنے کے لئے یہ کافی تھا۔ اور ہم جیسے وطن کی آزادی کے لیے لڑنے والے لوگ اس کی سزا بھگتنے کے لیے ماخوذ تھے لیکن یہ طے تھا کہ ان کی بڑھتی ہوئی جارحانہ زیادتیاں خود انہی کے حق میں سم قاتل تھیں اور ان کی راہ میں کانٹے بو رہی تھیں۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے عظیم ہیکل کی شکست و ریخت کے سارے انگریزی منصوبے خاک میں ملتے جا رہے تھے۔ میں اس حقیقت کا بڑے دکھ کے ساتھ اظہار کر رہا ہوں کہ اس سازش میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ بہت سارے ہندوستانی اعلیٰ دماغ و ذہنیت والے بھی شامل تھے۔

یقیناً، ان انگریزوں کو نیتاجی کی لیڈرشپ کوالٹی" سے خوف تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ نیتاجی کی اس صلاحیت کے سامنے بے حد حقیر ہیں۔

آخر یہ "لیڈرشپ کوالٹی" کیا تھی؟ نیتاجی سبھاش چندر بوس محض ایک لڑاکو فوجی تھے اور کچھ بھی نہیں؟ کیا نیتاجی نے محض یونہی ایک فوجی تنظیم قائم کر لی تھی؟ کیا وہ سماجی، مالی، سیاسی اور بین الاقوامی معاملات سے اچھی طرح واقف تھے؟ کیا ان کا کوئی اپنا تصوّراتی اور فکری موقف تھا؟ یہ اور ایسے کئی ایک سوالات تھے جن پر کھل کر بحث نہیں کی گئی۔ نئی نسل کے سامنے نیتاجی کی اہمیت اور ان کے افکار و خیالات کی تشریح و وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد قومی جنگ آزادی کے عصری جانبازوں کو من چاہے ڈھنگ سے بدنام کرنے کی طے شدہ ذہنیت میں شرانگیزی اور ضد کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس کے چلتے تاریخ کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ قومی تحریک سے اپنے وقت کے کئی عظیم الشان اشخاص کو خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کہتے ہوئے میرا دل دکھ رہا ہے، کہ یہ حرکت نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ساتھ بھی کی گئی۔ ان قومی نقوش کی تاریخی عظمت کو حرف غلط کی طرح مٹا کر تاریخ مرتب کرنے والا نہ صحیح معنوں میں ایماندار کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اصول پسند۔ میں کوئی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں لیکن، اپنی موجودہ نسل کے کمسن دوستوں کو تاریخ کے اس نامناسب برتاؤ بلکہ سازش سے آگاہ ضرور کرانا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ نیتاجی کی فکری بصیرت پر ذرا دیر غور کیا جائے اور اندھیرے میں ان کی گم شدہ شخصیت کو اس کی اکملیت میں تلاش کیا جائے۔ نیتاجی کے ساتھ عمر کا جو حصہ میں نے صرف کیا، وہ ایک پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے انہیں بے حد قریب سے دیکھا ہے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے مجھے ایک دوست اور بھائی کا درجہ دیا۔ میں ان کی ذاتی باتوں اور دیگر معاملات میں بھی سہیم و شریک رہا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے ملک کی آزادی کے بارے میں ہی غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ دراصل یہ سب یک بیک نہیں ہوا تھا۔ وہ جس زمین پر کھڑے تھے اس کی طبعی طور پر تشکیل ان کے ابتدائی ایام سے ہی ہونے لگی تھی۔ نیتاجی اپنی شخصیت کی تعمیر کو دیش بندھو چترنجن داس سے متعلق کرتے تھے۔ وہ دیش بندھو کو اپنا استاد مانتے تھے۔

دیش بندھو چترنجن داس

اس استاد و شاگرد کی ملاقات بھی ایک اتفاق تھی۔ ۱۹۲۱ء کی ۱۰ دسمبر کو انگریزی قانون توڑنے کے ایک جرم میں گرفتار کئے گئے تھے دیش بندھو چترنجن داس، مولانا ابوالکلام آزاد اور سبھاش چندر بوس۔ اس جرم میں ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو یہ تینوں نیتا چھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔ یہ سبھاش بابو کی جیل خانے کی پہلی سیر تھی۔ اتفاقاً سبھاش بابو اسی جیل میں رکھے گئے جہاں دیش بندھو

کو جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہیں ان دونوں میں ارتباط قائم ہوا تھا اور لگاتار میل ملاقات سے فوائد حاصل ہوئے — سبھاش بابو دیش بندھو کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جیل میں سبھاش بابو نے ان کا کھانا پکانے سے لے کر ان کے سکریٹری تک کے امور انجام دئے تھے۔ سنگاپور میں اپنے ایام گزشتہ کو سبھاش بابو اکثر یاد کرتے تھے۔ ایسے ہی کسی وقت میں انھوں نے مجھے بتایا تھا — "جانتے ہو محبوب، انگریزی حکومت نے دیش بندھو کے ساتھ مجھے جیل بھیج کر بڑا ہی اچھا کام کیا تھا

میں نے جیل میں دیش بندھو کے ساتھ رہ کر وہ سارے "ٹیکنک" ان سے سیکھے جو ایک لیڈر میں ہونا چاہیئے۔ وہ صرف میرے گرو ہی نہیں تھے بلکہ ماں باپ، بھائی اور دوست بھی تھے۔ یہ انہی کی تربیت کا اثر ہے کہ آج میں تم جیسے نوجوانوں کو ساتھ لے کر انگریزوں کے دانت کھٹے کر رہا ہوں حالانکہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آزاد ہند فوج کی کامیاب تنظیم دیکھ کر ان کی روح کو بڑی طمانیت ہوتی ہوگی چلو ہم دونوں ان کی یاد میں دو منٹ خاموش رہیں۔" یہ کہہ کر نیتاجی کھڑے ہو گئے تھے اور اس دن ہم دونوں نے خاموشی اختیار کر کے اس پاکیزہ روح کو تہہ یہ خلوص پیش کیا تھا۔ آج سوچتا ہوں "سبھاش چندر بوس" جیسا بے مثال قائد اور عظیم ترین رہنما اس ستّر کروڑ آبادی والے ہندوستان میں کیا ایک بھی نہیں رہ گیا ہے؟ وہ سبھاش جو ذہانت اور صلاحیت کا پتلا تھا، بات کا دھنی تھا اور ملک و قوم کے لیے سرفروشی کو ایک کھیل سمجھتا تھا، جب چاہتا ہر طرح کا عیش اور ہر طرح کا آرام حاصل کر سکتا تھا، اس نے آئی سی ایس جیسے معزز عہدے کو ٹھکرا کر ایک راہ پر خار اپنے لیے چُن لی، موت کی چھاؤں میں زندگی کے لمحات گزارنا اپنا شعار بنالیا! ذرا دیکھیئے اس طرز زندگی کو، اس کا اندازہ اور احساس ان دلوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے بلاؤں کا سامنا کیا ہے ورنہ ع کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا!

انگلینڈ سے لوٹ کر وہ اپنے آرام اور سُکھ کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا اور آزادانہ کر سکتا تھا اس لئے کہ اس کا تعلیمی ریکارڈ بڑا شاندار تھا، مگر اسے یہ سب گوارہ نہ ہوا، اور ہوا یہ کہ وہ برطانوی سامراج سے جس کی طاقت دنیا میں مثالی تھی، متصادم ہو گیا! یہ جیل کی سیر اس کی سامراجی طاقت سے مخالفت کی شروعات تھی۔

اس دل میں جو آتش شعلہ فگن تھی وہ ان زندانی تجربات سے اور ملتہب ہو گئی۔ جیل سے آزاد ہونے کے بعد بیرونی فضا کا کچھ اور ہی منظر تھا! "چوری چورا" یو حادثے ہوئے ان کو لے کر گاندھی جی نے ترک موالات کے جاری سلسلوں کو ملتوی کر دیا تھا۔ گاندھی جی کا یہ فیصلہ اس وقت کے سارے نیتاؤں کو پسند نہیں آیا تھا۔ اترپردیش کے ضلع گورکھپور میں چوری چورا کسانوں کے نکالے گئے ایک جلوس پر انگریزی حکومت نے اندھا دھند گولیاں چلائی

تھیں۔ ناراض بھیڑ نے تھانے پر ہلّہ بول دیا تھا اور آگ لگادی تھی۔ اس وقوع میں انیس سپاہی مارے گئے تھے۔ اس معاملے میں بہت سارے لوگ گرفتار کیے گئے اور انہیں پھانسی اور طویل سزائیں ہوئیں۔ "چَوری، چَورا حادثے" کے ظالمانہ رخ کو دیکھ کر گاندھی جی نے کہا تھا —— بھارت ترک موالات کے لیے تیار نہیں ہے کیوں کہ اس میں "تشدد" کا پہلو ہے۔ اسی وجہ سے ترک موالات تحریک واپس لے لی گئی۔

چیلنج بھرا وہ راستہ

دراصل گاندھی جی کا یہ اقدام نیتا جی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ جیل سے چھوٹتے ہی انہوں نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ——

موہن داس کرم چند گاندھی قوم کے پِتا (بابائے قوم) اور ہم سبھی کے باپو بھی ہیں۔ میں ان کی عزت کرتا ہوں، لیکن جس طرح سے انہوں نے چَوری۔ چَورا حادثے کی مذمت کی ہے، اس کی میں مخالفت کرتا ہوں۔ یہ کیسا مذاق ہے کہ گوری حکومت ہم پر گولی چلائے اور ہم مُردوں کی طرح خاموش تماشے دیکھیں! میں تو کھلے عام کہتا ہوں کہ اگر یہ حکومت گولی اور بارود سے لیس ہے، تو ہم ہندوستانیوں کو بھی گولی اور بارود سے لیس ہونا پڑے گا۔ میں تلک کے اس اعلان پر یقین کرتا ہوں کہ "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اسے لے کر رہیں گے"۔ بلا سے اس کے لیے مٹ کیوں نہ جائیں۔" نیتا جی کی یہ تقریر آنے والے وقت کی نقیب معلوم ہوتی تھی اور یقین مانیے کہ یہ وہ پہلے لیڈر تھے، جس نے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ ان کا وجود لندن تک کی نیند حرام کر دے گا۔ ان کی "لیڈر شپ کوالٹی" کا جیسے جیسے لوگوں کو اندازہ ملتا گیا، لوگ ان کے نام سے ہی خوف کھانے لگے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی لیڈر اس شیر کی دہاڑ سے کانپ اٹھے تھے۔ دراصل یہیں سے "قومی تحریک" میں "گرم" اور "نرم" دَلوں کا بیج پڑ گیا تھا۔ "ترک موالات" کی واپسی کے بعد سارے نیتا جیل سے چھوٹ گئے۔ اس وقت کانگریس کے سامنے دو طرح کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستے پر چلنے والے وہ لوگ تھے جو کسی طرح کی تبدیلی کی بجائے تعمیری کاموں سے انگریزوں کے قدم اکھاڑنا چاہتے تھے، جبکہ دوسرے راستے کے لوگ چاہتے تھے کہ ہم تعمیری کام ضرور کریں، قانونی مجالس میں شرکت کریں لیکن ہندوستان سے گوری حکومت کا صفایا کرنے کے لئے فوجی تیاری کے ساتھ مورچہ بندی بھی کریں۔ سبھاش چندر بوس دوسرے راستے کے حامی تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ ہندوستانی عوام بھی یہی چاہتے تھے۔ یہ اس لیے بھی کہ بہت تھوڑے وقت میں ہی نیتا جی کو ہندوستانی جنتا بے انتہا چاہنے لگی تھی۔

آزادی کی لڑائی کے لیے وہ ایک باقاعدہ سپاہی کی طرح پوری تیاری سے مستعد ہو گئے تھے۔ اسی دوران دیش بندھو نے انہیں اپنی ادارت میں نکلنے والے بنگلہ روزنامہ "بنگلہ کتھا" کا مدیر بنادیا۔ یہ اخبار 'سوراج دل'

کی طرف سے نکالا جاتا تھا' جو انجمن دستور ساز میں داخلے کا حمایتی تھا۔ اس کے ساتھ ہی "فارورڈ" نامی ایک انگریزی اخبار شروع کیا گیا جس کے مدیر، منتظم اور نگراں سبھاش بابو تھے ــــــ اس کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی تھی۔ یہاں سے انہیں دن۔ رات لگاتار کام کرنے کی عادت پڑی' جو بعد کے دنوں میں ان کی زندگی کا حصہ بن گئی۔

کوئی اس بات پر غم نہ کرے

پہلی عالمی جنگ کے دوران ہندوستان میں ایسی مختلف تنظیمیں آہستہ آہستہ ابھرنے لگی تھیں ۱۹۲۹ء میں ترک موالات تحریک کے ساتھ ہی ایسی تنظیمیں ابھر گئی تھیں۔ اتر بھارت میں ان تنظیموں کی شروعات سے انگریزی حکومت تب چوکنا ہوئی جب ایک انقلابی نیتا کلکتہ کے سفر کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے پاس سے جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے سرکار بوکھلا گئی تھی۔ ایسی تنظیموں کو کچل دینے کے لیے سرکار نے ایک حکمنامہ جاری کیا اور اسی حکمنامہ کے تحت ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو سبھاش بابو گرفتار کر لیے گئے تھے۔ یہ گرفتاری ان کی نظر بندی میں تبدیل ہو گئی۔ ان پر کڑے پہرے بٹھا دیے گئے۔ ایسے وقت میں وہ جن غریب طلبا اور دوسرے پریشان حال لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے' ان کی مدد کے لیے یہ ذمہ داری انہوں نے اپنے بڑے بھائی شرت چندر بوس پر ٹال دی۔ لاکھ مصیبتوں میں پھنسا یہ آدمی اپنی چھوٹی بڑی ہر ذمہ داری کے لیے کتنا خبردار اور حساس تھا ان کے عظیم کارناموں میں سے یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سبھاش چندر بوس بہ نفس نفیس اپنے کارناموں اور انسانی خوبیوں کی ایک زندہ مثال خود تھے۔ گرفتاری کے بعد نیتا جی پہلے کلکتہ کے "علی پور سینٹرل جیل" میں رکھے گئے۔ بعد میں انہیں "مریم پور جیل" بھیج دیا گیا۔ یہ انقلابیوں کو نظر بند رکھنے کے لیے مشہور جیل تھا۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء کی آدھی رات کو وہ دوبارہ کلکتہ لائے گئے جہاں سے انہیں برما کے مانڈلے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ دیش سے باہر برما جیل بھیجے جانے کے پیچھے انگریزی حکومت کی گہری سازش تھی۔ حکومت جانتی تھی کہ دیسی جیل میں سبھاش بابو کا انقلابیوں کے ساتھ تعلق قائم رہیگا۔ احتیاطاً انہیں برما بھیج دیا گیا' جیل میں ہی انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی' جو خفیہ طریقے سے باہر آ گئی تھی۔ اس کتاب کا ہندوستان میں چھپنا ممکن نہیں تھا' اس لیے یورپ میں چھپی' جسے لوگوں نے "بھارتیے سنگرام" کے نام سے جانا۔ یہ کتاب اور اس کی اشاعت انگریزی حکومت نے ممنوع کر دی تھی۔ لیکن ۱۹۳۸ء میں جب سبھاش بابو کانگریس کے صدر بنے' تب اس کتاب پر سے امتناعی احکام اٹھا لیے گئے۔ اس کتاب میں نیتا جی نے اس وقت کے ہندوستان اور اس کی آزادی کے مسائل پر تبصرہ اور جائزہ پیش کیا تھا۔ یہیں یہ ذکر بھی موزوں ہوگا کہ نیتا جی کی زندگی سے متعلق چند معاملات کو جان لیا جائے۔ دراصل' ایک شخصیت کی مکمل تصویر صاف ابھرے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا جائزہ لیا جائے۔ بہر حال' سبھاش بابو کو مطالعہ کی طرف گہرا رجحان تھا اور ان کے مخصوص موضوعات' تاریخ' نفسیات' ادب'

ایرادھ وگیان (تعزیرات کا علم) جیل خانوں کی اصلاح، مذہب اور فلسفہ تھے۔ خاص طور سے فلسفہ کی طرف ان کا گہرا رجحان تھا۔ برما جیل میں قید و بند کے دوران انہیں بڑی تکلیف پہنچی، پھر بھی انہوں نے سب کچھ خندہ روئی کے ساتھ برداشت کر لیا۔ اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا — "جانتے ہو محبوب، جیل کی عمارت نہ پتھر کی بنی تھی نہ اینٹ کی، بلکہ تختوں سے بنی تھی۔ عمارت بالکل سرکس والوں کے جانوروں کے کٹہروں کی طرح لگتی تھی۔ ان عمارتوں میں ہواؤں کے جھونکے سائیں سائیں کرتے تھے۔ گرمیوں میں شدید گرمی لگتی تھی اور جاڑوں میں بہت جاڑا لگتا تھا۔ برسات میں بھی چین نہیں ملتا۔ پھر بھی میں جیسے تیسے وہاں رہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ دیس کے لیے ایک طرح کا امتحان ہے جس سے مجھے عہدہ برآ ہونا ہے۔"

قید و بند کے دوران بھی نیتاجی اپنے طور پر اختیارات کے لیے لڑتے رہے۔ اسی عالم میں جیل کے قیدیوں کی سہولتوں کے مسائل کو لے کر انہوں نے فاقہ کشی شروع کر دی۔ یہ فاقہ لگاتار دس دنوں تک چلتا رہا۔ آخرکار انگریز افسروں کو ان کی مانگیں پوری کرنی پڑیں۔

جیل میں اس واقعہ کے بعد نیتاجی کی صحت خراب ہونے لگی تھی۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں نیتاجی جیل ہی میں نہ مر جائیں۔ نتیجتاً ان کی رہائی کے لیے تحریک زبردست ہونے لگی۔ حکومت گھبرا اٹھی۔ تب افسروں نے نیتاجی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر تم رہائی کے بعد کسی طرح کی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لینے کا وعدہ کرو تو تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ نیتاجی نے اس تجویز کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے جو خط لکھا وہ ان کی عمدہ "لیڈرشپ کوالٹی" کا نمونہ ہے۔ انہوں نے خط میں لکھا تھا — "کوئی اس بات پر غم نہ کرے کہ میری رہائی کی امید کم ہے۔ سب سے پہلے میرے ماں۔ باپ کو تسلی دیں کیوں کہ انہیں بڑی تکلیف ہوگی۔ پھر میرے دوستوں کو سمجھائیں، ہمیں انفرادی طور سے اور ساتھ ہی اجتماعی طور سے ساری تکلیفیں سہنی ہیں، تب جا کر ہمیں آزادی کا خزانہ ہاتھ لگے گا۔

زمین جو تیار ہوئی

"ہمارے دل کو اطمینان ہے، مجھ پر تکلیف خدا نازل کرے، میں اسے جھیلنے کے لیے تیار ہوں، میں اپنے ڈھنگ سے اپنی قوم کے پہلے کے گناہوں کے بدلے دکھ اٹھا رہا ہوں اور مجھے اس کفارہ ادا کرنے سے مسرت ہے۔ ہمارے خیالات مردہ نہیں ہیں، ہمارے خیالات قوم کے دماغ سے مٹنے کے لیے نہیں ہیں۔ جوشیلی نسلوں سے ہمارے خیالات کی نشر و اشاعت ہوگی، یہ یقین ہی مجھے دکھ میں بھی متشکر اور ممنون کرتا رہے گا۔" نیتاجی کے عزم محکم کے آگے سرکار بے بس ہو گئی تھی۔ نیتاجی کی گرتی ہوئی صحت سے بھی حکومت ڈر گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر نیتاجی کو کچھ ہو گیا تو جنتا میں قیامت مچ جائے گی۔ اسی خوف کے چلتے ۱۶ مئی ۱۹۲۷ء کو نیتاجی رنگون سے

کلکتہ لائے گئے اور آخر کار ۱۶ ارمئی کو رہا کر دیے گئے۔

اپنی رہائی کے بعد نیتا جی کو اپنے گرو دیش بندھو چترنجن داس کی کمی بری طرح محسوس ہوئی۔ دیش بندھو کے نہ رہنے پر بنگال کی قیادت کا بوجھ انہی کے کاندھوں پر آپڑا۔ انہی دنوں "سائمن کمیشن" کے آنے کا بھارت میں چرچا ہونے لگا تمام قومی جماعتوں نے اس کمیشن کی مخالفت کا فیصلہ کر لیا تھا کیوں کہ اس میں ایک بھی ممبر ہندوستانی نہ تھا۔ نیتاجی نے دیش میں گھوم گھوم کر اسکی مخالفت شروع کر دی۔ ایسے وقت میں نیتاجی کے ساتھ جواہر لال نہرو بھی تھے۔

"سائمن کمیشن" کی مخالفت سے جنتا میں پیدا ہونے والی بے اطمینانی اور ناراضی سے نیتاجی کو بڑا آسرا ملا۔ ان کی دور بینی اور دوررسی بتا رہی تھی کہ اس رسوائے عالم کمیشن کے جو تباہ کن نتائج ہوں گے وہ ہندوستانیوں کے حق میں کیسے ہوں گے! انہیں یقین تھا کہ اس مخالفت کا جوش انگریزوں کی چولیں ڈھیلی کر دے گا۔ جنتا میں انقلابی تحریک پیدا کرنے کے لیے نیتاجی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ انہی دنوں دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگریس کا ۴۳ واں اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ یہی وہ تاریخی اجلاس تھا جس میں نیتاجی نے اپنی فوجی صلاحیتوں اور آئین پر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ جس کا تعلق اور تصور ہندوستان کی آزادی سے متعلق تھا۔ اسی اجلاس میں نیتاجی نے تقریباً جنگ کی آدھی تیاری مکمل کر کے رضا کاروں کا ایک دل بنا لیا تھا۔ تمام رضا کاروں کو فوجی تربیت کے ساتھ فوجی وردیوں میں جائے اجلاس پر تعینات کیا گیا، جس کے قائد اور افسرِ اعلیٰ خود نیتاجی تھے۔ اس اقدام پر جہاں انگریزی اخباروں نے تیکھی تنقید کی وہاں کانگریس کے صدر موتی لال نہرو نے بڑی تعریف کی۔

اس اجلاس میں کانگریس کے سامنے ایک عجیب مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوا یہ کہ مختلف ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور جو تقریباً تیس ہزار تھے اچانک امنڈ پڑے۔ مزدوروں کا یہ مشتاق ہجوم اپنے محبوب نیتا جی کی تقریر سننے اور ان کے درشن کے لئے امنڈ پڑا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اتنے بڑے ہجوم کو کیسے قابو میں کیا جائے! ساتھ ہی اجلاس میں شامل ہونے والوں سے کچھ فیس بھی لی جاتی تھی۔ مزدور نہ تو کسی قسم کی فیس دینے کے لیے تیار تھے نہ اجلاس سے واپس جانے کو راضی تھے۔ اس سے حکومت تو خوش ہوئی ہی اسکے پٹھو اخباروں کو خاطر خواہ اعتراضات کا موقع مل گیا۔

تاریخ خون سے لکھی جاتی ہے

یہ صورت حال بڑی پس و پیش والی تھی۔ کوئی نہیں چاہتا تھا کہ مزدور تیز و تند ہو جائیں اور معاملہ ہاتھ سے باہر چلا جائے۔ ادھر مزدوروں نے نعرہ بازی شروع کر دی تھی۔ لگا کسی پل بھی انہونی ہو سکتی ہے۔ نیتاجی رضا کاروں کے کپتان تھے۔ ان کے لئے یہ صورتحال اور بھی عجیب تھی۔ ان کے چاہنے والے ان کے لیے باہر شور و شر اور زبردستی کر رہے تھے، جبکہ ہر طرح کے خطرناک

حالات سے نبٹنے کے لیے خود ہر مورچہ انہی کو سنبھالنا تھا۔ ایسے وقت میں صدر پنڈت موتی لال نہرو نے انہیں طلب کیا۔ وہ خود دوڑ کر باہر گئے۔ مزدوروں کے جوش کو دیکھ کر انہوں نے اجلاس میں انہیں بلا فیس ادا کئے داخلے کی اجازت دیدی۔ ہاں سبھاش بابو نے اس کے باوجود ڈسپلین پر بڑی کڑی نظر رکھی۔ ان کے اصرار پر مزدوروں نے بڑے شائستہ اور ضبط کے ساتھ اجلاس کے پنڈال میں پیش قدمی کی اور اس طرح ایک عجیب مگر اپنے بیحد چاہنے والوں کے پیدا کردہ پریشان کن مسائل سے سبھاش بابو گھبرا گئے تھے۔ یہ ذکر میں نے اس لئے کیا کہ نیتاجی کی تنظیمی صلاحیت اور عوامی مقبولیت سے آئندہ پیدا ہونے والی صورتحال کا مثال ایک جائزہ لیا جا سکے۔ اب تک سارے ملک میں انقلابی تحریک نے بھی زور پکڑ لیا تھا۔ دسمبر ۲۷ء میں اتر بھارت کے چار جانباز وطن پرست جوانوں رام پرشاد بسمل، روشن سنگھ، راجندر ناتھ لاہڑی اور اشفاق اللہ کی سزائے موت نے ملک میں اس تحریک کو پروان چڑھا دیا اور ایک ہنگامہ خیز دھماکے کے ساتھ سردار بھگت سنگھ کا دل بھی وجود میں آگیا۔ اس دل پر بھی برطانوی حکومت کی طرف سے مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ اس کی رفتار قابل دید تھی۔ اس وقت کا منظر جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ لوگ آج کے ہندوستان کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، یقیناً ان کے یقین اور اعتبار کو گہرا دھکا لگا ہی ہے۔ آج میں ایک اور سچائی کو بالاختصار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے اپنی اپنی سہولتوں کے حساب سے حقائق کو تراش خراش کر یا تو "جی حضوری" کی رسم نبھائی ہے یا پھر شہیدوں کی قربانیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ شہادت کی ہر تاریخ سیاہی سے نہیں خون سے لکھی جاتی ہے اور جن لوگوں کا خون ابھی بھی سرد نہیں ہوا وہ تاریخ کی اس روایت کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔ سبھاش چندر بوس کی قربانی اور ملک و قوم کی خاطر ان کی خدمات کا اندازہ قلم کی سیاہی سے نہیں، دل کے خون سے لکھا جانا ممکن ہے! یہ دم بھلا کس میں ہے؟

دسمبر ۱۹۲۹ء میں نیتاجی سبھاش چندر بوس اور پنڈت جواہر لال نہرو کی مشترک کوششوں سے "تنظیم آزادی" "انڈیپنڈنس" نام کی ایک پارٹی قائم کی گئی۔ یہ واقعہ "لاہور کانگریس اجلاس" کے پہلے کا ہے۔

ایشیا کا آفتاب

"اس پارٹی کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے نیتاجی نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اعلان کیا تھا۔ "انگریزو، تم ہندوستان کو پوری آزادی دو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی سرزمین سے دور چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں جبراً لندن بھیج دیں گے۔"

نیتاجی کے اس اعلان نے اس وقت کے تمام ہندوستانی نیتاؤں کو جیسے کوئی راستہ دکھائی دیا۔ یہی راستہ "لاہور کانگریس اجلاس" کے اس نعرے میں تبدیل ہوگیا جسے لوگوں نے "پوری آزادی" کے نام سے جانا۔

اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے "پوری آزادی" کی تجویز کانگریس سے منوائی، جس کی تعریف مہاتما گاندھی تک نے بھی کی۔ یہاں پوری آزادی، جو کانگریس کی لڑائی کا ہتھیار بنی، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی دوراندیشی کا حاصل تھی اور بعد میں "لاہور کانگریس" کے نام سے دنیا میں متعارف کی گئی۔ "لاہور کانگریس اجلاس" میں "پوری آزادی" کا نعرہ درحقیقت نیتاجی کے فہم وادراک کی دین ہے، لیکن مابعد بڑی چالاکی کے ساتھ لوگوں نے یہ نعرہ اپنے کھاتے میں درج کرلیا۔ افسوس اس سرقۂ مقدس پر کیا تبصرہ کیا جائے! یہ ایک حقیقت ہے کہ نیتاجی خودستائی والے انسان نہ تھے اور نہ اپنی شخصیت کے نشرواشاعت کے خواہاں تھے، مگر تاریخی حقائق کی تحریف وتنسیخ کی کوشش کبھی سراہی نہیں جاسکتی، اور میرا یقین ہے کہ تمام سازشوں کے باوجود آنے والی نسل "ایشیا کے اس آفتاب" کی روشنی سے مستفید ہوتی رہے گی۔

۱۹۲۰ء کے اس اجلاس میں یہ اعلان یعنی "مکمل آزادی" ہی آخرکار کانگریس کا موقف بنا۔ آزادی کے ایسے پرجوش جذبے اور نیتاجی کی بے پناہ جنگی اور دفاعی صلاحیت اور غیر ممالک میں رہ کر صف بستگی ہمیں بتا رہی تھی کہ روزِ اول ہی سے ان کے لیے فضا ہموار ہو رہی تھی۔ ان کا اس پر یقین تھا کہ آزادی کی جنگ ایک مورچے سے لڑنے کی بجائے چوطرفہ لڑی جائے اور انہوں نے "آزاد ہند فوج" کو اسی زمین پر کھڑا کیا تھا۔ وہ دشمن کی نقل وحرکت پر خفیہ ذرائع سے نگاہ رکھنے کے قائل تھے تاکہ وقت سے پہلے اس کا صفایا کیا جاسکے۔ نیتاجی انگریزوں پر چوطرفہ حملہ کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ملک کا دھواں دھار دورہ کیا اور ہر جگہ جنتا کی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا وہ سب کو لے کر چلنا چاہتے تھے ——————

کیوں کہ تمام الگ الگ راستوں کے باوجود سب کا مقصد ایک تھا۔ وہ معتدل جماعت اور انتہا پسند جماعت اور دیگر انقلابی جماعتوں میں اختلاط اور اشتراکِ عمل چاہتے تھے، اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ساتھ ہی وہ چاہتے تھے کہ "بھارتیہ راشٹریہ کانگریس" مزدوروں کی تحریکوں سے بھی منسلک رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک "ٹریڈ یونین کانگریس" کے صدر بھی چنے گئے۔

ایسے ہی وقت میں اتر پردیش میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں "کسان آندولن" شروع ہوگیا۔ اس طرح کانگریس آندولن کو کسان، مزدور تنظیموں سے بڑی مدد ملی اور اس کی طاقت بھی بڑھی سب کو ساتھ لے کر چلنے کی یہ خوبی نیتاجی کی خاصیت تھی اور "آزاد ہند فوج" کی تنظیم میں یہ اصول بڑا کامیاب رہا۔ تمام تنظیموں اور دلوں کو ایک ہی

---

(۱) ایسے ہی رزم دوشن کے سلسلے میں نیتاجی کی طرح حسرت موہانی کا نام بھی تاریخ سے غائب ہوچکا ہے۔ (ع ۔ ر ۔ ب)

دھاگے میں پروکرانہیں دیا جو عمل کے لیے تیار کرنا ایک مشکل کام تھا لیکن نیتاجی اس میں کامیاب ہوئے۔

مارچ ۱۹۴۰ء "رام گڑھ کانگریس" کے دوران فکری اختلاف کا ایک دور شروع ہوا، حقیقتاً ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا، لیکن نیتاجی آزادی کی جنگ میں دشمن سے کسی طرح کے سمجھوتے کو فروغ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجتاً، اس اجلاس میں مخالفت کی لہر اٹھی اور بالآخر نیتاجی نے "سمجھوتا، مخالف سمیلن" کی تشکیل کی۔ اس سمیلن میں انہوں نے صاف طور پر اعلان کر دیا۔ نہ "یقین نہ رکاوٹ" یہاں انہوں نے ایک ایسی نزاعی تحریک شروع کر دینے کا اعلان کیا تھا جو ملک کی آزادی کے مقصد سے قطعی جدا نہ ہو سکے۔ اسی لئے میں ! یہ دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ انگریزی حکومت پر نیتاجی نے جس طرح چوطرفہ حملہ بول دیا تھا، وہ اس کے لئے بری طرح دردِ سر ثابت ہو رہا تھا۔

ہندوستان کی سرزمین سے بوریا بستر باندھ کر چل دینا انگریزوں کے لئے ناگزیر بن گیا تھا۔ مزدوروں، کسانوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی طاقت کو جنگ سے جوڑ دینے کی یہ خوبی نیتاجی کی "لیڈرشپ کو انوکھے" کی بے مثال ہے۔ نیتاجی کو نوجوانوں سے بے پناہ محبت تھی اور ان کی ساری امیدیں نوجوانوں ہی پر منحصر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ "آزاد ہند فوج" میں زیادہ تر بیس ۲۰ سے پچیس ۲۵ برس کے جوان شامل کیے گئے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ محبوب! اگر آزاد ہند فوج "کے نوجوان فوجیوں میں اسی طرح جوش جنون پروان چڑھتا رہا" تو وہ دن دور نہیں جب ہماری "دلی چلو" للکار کامیاب ہو کر رہے گی اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے جیسے تمام جوان فوجیوں میں وہ جوش قائم رہے گا۔ دراصل، جوانوں کی طاقت ہی قوم کی بنیاد ہے۔

نیتاجی پر حملہ

۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس کے اجلاس کے فوراً ہی بعد دیش میں نوجوانوں کی کئی ایک تنظیمیں بڑی تیزی سے عالم وجود میں آئیں جن میں یوسف مہر علی کی صدارت والی کل ہند نوجوان کانگریس کی مجلس عاملہ پریشد کے ایک ممبر نیتاجی خود تھے۔ اس کے علاوہ اکھل بنگ چھاتر سنگھ جس کے صدر تھے ڈاکٹر جی۔ کے مکھرجی اور بنگال پریسیڈنسی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن جیسے سنگٹھن (تنظیم) بھی تیار ہو گئے تھے۔ ان تمام تنظیموں کو سبھاش بابو کی تائید ملتی رہی۔ دراصل، سبھاش بابو چاہتے تھے کہ ہندوستانی نوجوان اپنی پوری طاقت سے بدیشی سرکار کا مقابلہ کریں۔ یہی وجہ تھی کہ "انوشیلن سمیتی"، "یوگانتر دل" اور بھگت سنگھ کی قیادت والے "ہندوستان ری پبلیکن آرمڈ گروپ"، جیسی انقلابی تنظیموں سے سبھاش بابو کے تعلقات برابر قائم رہے۔ انقلابی جماعتوں سے نیتاجی کے رابطوں کی خبر برطانوی سرکار کو اپنے جاسوسی محکموں کے ذریعہ مل جاتی تھی۔ باوجود اس کے، ان کے خلاف پکا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلا سکی، ہاں، جنوری ۱۹۲۵ء میں ان کی گرفتاری ہوئی ۱۸۱۸ء میں لاگو "تھرڈ ریگولیشن"

کے تحت۔ اس گرفتاری کے بعد انہیں برما کے "مانڈلے جیل" میں قید کیا گیا تھا۔

کانگریس میں بڑھتی ہوئی گروہ بندی کی وجہ سے نیتا جی سبھاش چندر بوس کافی متفکر تھے۔ وہ اپنے تمام ہمخیال دوستوں سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے تاکہ گروہ بندی کو ختم کیا جاسکے۔ کل ملاکر نیتا جی اس نتیجے پر پہنچے کہ کانگریس کو ہر حال میں قومی تحریک کی طرف مرکوز کردیا جائے، جس سے انگریزوں کے خلاف ملکی پیمانے پر مقابلہ شروع ہو جائے۔

اسی درمیان "نمک ستیاگرہ" شروع ہوا، جس میں ملکی پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ تمام کوششوں کے باوجود کانگریس میں گروہ بندی بڑھتی جارہی تھی اور ایک گروہ بالخصوص نیتا جی کی مخالفت پر تلا ہوا تھا۔ نیتا جی کی مخالفت کرنے والے ہی لوگ تھے جنہیں اپنا وجود حقیر نظر آرہا تھا اور وہ اس لئے بھی خوفزدہ تھے کہ نیتا جی کی شخصیت کے آگے ان کی من مانی نہیں چل رہی تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب ۱۹۳۱ء میں نیتا جی کے خلاف سازش کی گئی۔ دراصل، ہوا یہ کہ نیتا جی "بھارتیہ ٹریڈ یونین کانگریس" کے صدر بنائے جاچکے تھے۔ انہیں کی قیادت میں مزدوروں کی ایک عام سبھا ٹاٹا نگر میں منعقد کی گئی تھی۔ نیتا جی جس وقت اس سبھا میں بول رہے تھے عین اسی وقت کچھ لوگوں نے ان پر اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کیا۔ ایسے وقت میں کچھ لوگوں نے ان کی حفاظت کی خاطر انہیں کسی محفوظ مقام پر لے جانے کی پیشکش کی۔ مگر پیشکش کو نیتا جی نے سختی سے ٹھکرا دیا۔ وہ سبھا چلتی رہی اور میں بیحد فخر کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ آخرش نیتا جی کی شخصیت وہاں بھی سب پر حاوی رہی اور ان کی مخالفت کرنے والے لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔

جب گاندھی جی گرفتار ہوئے

نیتا جی سبھاش چندر بوس کی پر وقار شخصیت سے ان کے مخالفین میں بوکھلاہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ یہ مخالفت دوطرفہ تھی۔ ایک طرف جہاں برطانوی حکومت کی سختیوں کا نیتا جی کو شکار ہونا پڑا تھا، وہیں دوسری طرف اپنے دل کی اندرونی گروہ بندی ان کے خلاف کمر کس چکی تھی۔ بہر حال، نیتا جی جن دنوں جیل میں تھے، ٹھیک اسی دوران لندن میں تین گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز ہوئی۔ یہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کی مدت میں ہوئیں۔ ان کانفرنسوں میں ہندوستانی مسائل کے حل ڈھونڈنے میں برطانوی کوشش کی ناکامیابی دیکھ کر سبھاش بابو بہت غمزدہ تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کے "سونے او گیا۔ آندولن" کے بدلے ۱۹۳۱ء میں ہوئے "گاندھی ارون پیکٹ" کے علاوہ اور کوئی بہتر نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔ ہاں، انگریز بھارتی نیتاؤں سے بن کین پرکارین سمجھوتہ کر کے آندولن کی تیزی روکنے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ اس حقیقت کا خلاصہ لارڈ ہیلی فیکس نے خود اپنے تذکرے میں بھی کیا ہے۔ انگریزی سرکار کو اس کامیابی نے "آندولن" کو

کھلنے کے لیے کافی وقت مل گیا اور مجھے دُکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ "راشٹریہ آندولن" کے ساتھ ہونے والی ایسی سازشوں سے ہمارے راشٹریے نیتا تک ناواقف رہے۔ چوتھی دہائی کے ابتدائی ایام میں برطانیہ بری طرح مالی مشکلات سے گزر رہا تھا، حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اسے سرکپٹ سورن راشی کی بنیاد پر اپنے سکّوں کی قیمت رکھنے کی گولڈ "اسٹینڈرڈ پالیسی" تک چھوڑنی پڑی تھی۔ ادھر تین گول میز کانفرنسوں کا کوئی نتیجہ خاص نہ نکلا تھا، جبکہ "دوسری گول میز کانفرنس" میں تو خود مہاتما گاندھی نے بھی حصہ لیا تھا۔ الٹا ہوا یہ کہ اس کانفرنس سے لوٹنے کے فوراً بعد مہاتما گاندھی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت برطانیہ میں وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کی سرکار حکمراں تھی۔ یہ ایک دم ناگہانی حادثہ نہ تھا، کیونکہ لیبر (مزدور) نیتا ہونے کے سبب ریمزے سرکار سے ایسی امید نہیں تھی۔ دراصل، ریمزے میکڈانلڈ مزدور نیتا ہونے کی وجہ سے کافی مقبول عوام ہو گئے تھے اور ان کی ہندوستان پر لکھی ہوئی کتاب "برٹش نوکرشاہی" کا پردہ فاش کر چکی تھی۔ ایسا لگا تھا، وہ ہندوستان کی آزادی کو جانبدار اور دیانت دارانہ انداز سے دیکھیں گے، لیکن "گول میز کانفرنس" کے ساتھ ہی سارا بھرم ٹوٹ گیا۔ ہندوستان پر برطانوی حکومت کے مسئلے کو لے کر برطانیہ کی سبھی سیاسی پارٹیوں کے رخ ایک جیسے تھے۔ ایسے میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر سن کر نیتاجی کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ انہوں نے بھارت کے اس زمانے کے وائسرائے لارڈ اِرون کے نام جیل سے ہی ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کی حیثیت تاریخی دستاویز جیسی ہے۔ نیتاجی نے لارڈ اِرون کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا —— "مہاتما گاندھی ہمارے باپو اور بابائے قوم دونوں ہی ہیں۔ آپ کی حکومت انہیں گرفتار کر کے یہ سوچتی ہے کہ ہندوستانی ڈر جائیں گے، تو یہ آپ لوگوں کی سراسر غلط فہمی ہے۔ باپو کو جیل سے رہا کرانے کے لیے میں اپنے انقلابی جوانوں کے ساتھ آندولن کی رفتار تیز کرنے جا رہا ہوں۔"

گاندھی — اِرون پیکٹ

نیتاجی کا لکھا یہ خط، جہاں ان کی ہمت اور دلیری کا آئینہ دار ہے، وہیں مہاتما گاندھی سے بے پناہ محبت کا شاہد بھی ہے۔ یہ خط خود بولتا ہے کہ نیتاجی کے دل میں گاندھی جی کا کتنا احترام تھا، لیکن تاریخ کی صداقت کو بڑی خوبصورتی سے بٹّے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے —— اور زیادہ تر کوشش یہ رہی کہ گاندھی اور سبھاش کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے اور خود تاریخ نویس بھی اس کا نظارہ کریں، چونکہ ایسا خود ان کا بھی منشا تھا۔

میں تاریخ نویسوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کس مقصد کے تحت لارڈ اِرون کے نام نیتاجی کا نوشتہ مکتوب آج تک نہیں چھاپا گیا؟ کیا سبب ہے کہ تاریخ کی ایسی بہتیری صداقتیں جو نیتاجی کی شخصیت کی سطح کو بہت اونچا کرتی ہیں انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی —؟

اسی درمیان "گاندھی ارون پیکٹ" کے تحت جیل میں قید سارے نیتا رہا کر دیئے گئے۔ نیتاجی بھی رہا ہوئے اور پھر ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ دراصل شہر کلکتہ کے بحیثیت میئر وہ اس دن "اکٹر لونی اسمارک" کی طرف ایک سبھا منعقد کرنے جا رہے تھے۔ سرکار نے اس سبھا کو ممنوع قرار دیدیا تھا۔ راستے ہی میں پولیس نے اس جلوس پر حملہ کر دیا۔ بہت سارے لوگوں کو چوٹیں آئیں۔ کئی ساتھیوں کے سر تک پھٹ گئے، ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اس وقت نیتاجی کے ہاتھ میں ترنگا تھا۔ یاد دلا دوں کہ یہ وہی ۲۶ جنوری کا دن تھا، جس دن لاہور میں آزادی کے مقصد و مدعا کا بالاعلان اظہار کیا گیا تھا۔ اسی دن پولیس کی بے پناہ حملوں کے باوجود نیتاجی کے ہاتھوں سے جھنڈا چھیننے کی ہر کوشش میں ناکامیاب رہی۔ نیتاجی ترنگے کو ہوا میں لہراتے رہے جب تک کہ ان کے ہاتھ کی انگلیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اس جدوجہد میں نیتاجی کی کئی انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور سر پھٹ گیا۔

۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو نیتاجی سبھاش چندر بوس جب بمبئی سے لوٹ رہے تھے تو انہیں بغیر کسی معقول وجہ کے اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے بعد نیتاجی مارچ ۱۹۳۳ء تک نظربند رکھے گئے۔ اسی دوران ان کی صحت بری طرح خراب ہو گئی۔ اس مرتبہ انہیں معقول علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ان کا یورپ جانا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ علاج کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکار نے انہیں یورپ جانے کی اجازت دیدی۔

سبھاش اُس مٹّی کے نہیں بنے تھے

کانگریس صدر کے اس چناؤ کی صورت حال عجیب ہو گئی تھی۔ گاندھی جی اس بات کے لئے قطعی راضی نہیں تھے کہ سبھاش چندر بوس دوبارہ کانگریس کے صدر بنیں اور ہوا یہ کہ مہاتما گاندھی نے بطور اپنا امیدوار پٹا بھی سیتا رمیا کو نیتاجی کے خلاف کھڑا کر دیا۔ یہ بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ ہاں! یہ سچ ہے کہ گاندھی جی کے متعلق کسی کے دل میں کڑی کے جذبات نہ تھے، لیکن فکری اختلاف کے تحت نیتاجی کوئی ویسا سمجھوتا بھی نہیں کر سکتے تھے اور آخر کار ہوا وہی کہ پٹا بھی سیتا رمیا نیتاجی کے مقابلے میں انتخاب ہار گئے۔ نیتاجی ایک بار پھر کانگریس کے صدر چن لیے گئے۔ گاندھی نے بڑے غمناک انداز میں کہا تھا —— دی ڈیفیٹ آف سیتا رمیا از دی ڈیفیٹ آف مَین "(سیتا رمیا کی ہار میری ہار ہے)

یقیناً یہ وقت کانگریس کی اندرونی حالت کا غماض تھا۔ مہاتما گاندھی جیسے محترم نیتا کو شکست دینا تاریخ میں چاہے جس طرح درج کیا جائے، پر یہ سچ ہے کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کی "لیڈرشپ کوالٹی" سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے دوبارہ کانگریس صدر چنے جانے سے کانگریس میں کچھ عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نیتاجی کی یہ کامیابی اور پٹا بھی سیتا رمیا کی ہزیمت نے فکری اختلافات کو ہوا دیدی۔ خود گاندھی جی نے اس

حادثے کو لے کر راجکوٹ میں فاقہ کشی شروع کر دی! اس کا اثر تمام دوسرے نیتاؤں پر پڑا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نیتاجی اور مہاتما گاندھی کے درمیان کوئی خلیج حائل ہو جائے۔ ادھر گاندھی جی نے فاقہ کشی کے دوران یہ کہہ ڈالا کہ سبھاش کو میرے مشورے سے کانگریس کی مجلس عاملہ میں دراندازہونا چاہیے۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے نیتاجی اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں عہدۂ صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیے اور آخر کار انہوں نے استعفیٰ دیدیا۔ ۱۹۳۹ء کے ماہ ستمبر میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ نیتاجی کو اس کا قبل ہی سے اندازہ تھا۔ انہوں نے کئی موقعوں پر یہ اعلان کیا تھا کہ ہمیں اس جنگ سے جس کے قوی امکانات ہیں، فائدہ اٹھانا چاہیے اور انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور عالمی جنگ چھڑ گئی۔ کانگریس نے اپنے دائرۂ کار کے وزراء کو استعفیٰ دینے کے لیے کہہ دیا۔ دراصل، یہ تغیر و تبدل کا ایسا وقت آگیا تھا کہ کوئی کسی اہم نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اسی درمیان، مارچ ۱۹۴۰ء رام گڑھ کانگریس اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کے صدر تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ یہیں سبھاش بابو نے بھی سمجھوتا ویرودھی سمیلن، قائم کیا، جو بڑا کامیاب رہا تھا۔ بہرحال، اس سمیلن میں کانگریس نے برطانوی حکومت سے یہ پوچھا تھا کہ جنگ کے مقاصد کیا ہیں؟ اگر اس جنگ کا مقصد جمہوریت کی حفاظت ہے، تو کانگریس اس کی حمایتی ہے۔ اس بنا پر بھارت اس جنگ میں کھل کر تعاون کر سکتا ہے، ورنہ اس کی شرکت ممکن نہیں ہے۔ لیکن برطانوی سرکار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سرکار کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر کانگریس نے "ویکتی گت ستیاگرہ" (شخصی عدم تعاون) شروع کر دیا۔ نیتاجی ۱۹۴۰ء کی ۲۰ر جولائی کو اپنا ستیاگرہ شروع کرنے والے تھے، لیکن اس کے پہلے ہی بنگال سرکار کے حکم سے "بھارت رکشا قانون" کے تحت انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ودھان پریشد کے لئے انتخاب ہوئے۔ اس وقت نیتاجی جیل میں تھے۔ انہوں نے جیل سے ہی اپنی امیدواری پیش کروادی تھی اور وہ ڈھاکہ نِرواچن چھیتر (علاقہ یا انتخابی حلقہ) سے چُن لیے گئے تھے۔ یہ کامیابی ان کی عوامی مقبولیت اور محبوب شخصیت کی وجہ سے ہوئی تھی۔ نیتاجی کے لیے یہ جیت اس لیے بھی اہم تھی کہ اس وقت تک وہ کانگریس کی رکنیت سے خارج کیے جا چکے تھے۔ نیتاجی کو شاعرِ مشرق رابندرناتھ ٹیگور کی بھی دعاؤں کی سعادت حاصل تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ ۱۹۳۸ء ۱۹ر جولائی کی بات ہے۔ نیتاجی نے ایک "مہاجاتی سدن" کے قیام کے لیے شہر کلکتہ کارپوریشن سے زمین طلب کی تھی۔ اس "سدن" کا مقصد تھا شہیدوں اور ملک کے خدمت گزاروں کی یادگار میں ان کی تصاویر کو رکھنے کا بندوبست اور ایک ایسا منچ جہاں دیش کے نیتاؤں کی جماعت وقتاً فوقتاً سبھاؤں کا انعقاد کر سکے۔ ۲ر اگست کو کارپوریشن نے "سدن کے لیے زمین

دیدی، جس پر ۱۹؍ اگست ۱۹۴۰ء کو "مہاجاتی سدن" تیار ہو گیا۔

پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا

سدن کا افتتاح مہاکوی (شاعرِ اعظم) رابندر ناتھ ٹیگور نے کیا۔ اس وقت شاعرِ اعظم نے کہا تھا "بھارت کے اس مہان سدن میں ہم دیش کی ویرتا کی نیو رکھ رہے ہیں، پر ہماری شکتی ادھرت جاتی واد میں نہ ہو گی، جس میں شترو اور متر دونوں پر سندیہہ کیا جاتا ہے"۔ یہ وہ وقت تھا جب نیتاجی بے حد فکری الجھنوں کے دور سے گزر رہے تھے۔ ان کی بے چینی کو کوئی پناہ نہیں مل رہی تھی، تو اس کی وجہ تھی ہندوستانی سیاسی تحریکات کی نامتناسب چال۔ انہوں نے عالمی ملکوں میں گھوم کر یہ دیکھا جانا تھا کہ آزادی کی جنگ بازوؤں کی طاقت کے بل پر لڑی جاتی ہے، جبکہ دیش میں ویسی وسیع زمین نہیں تیار ہو پا رہی تھی۔ تحریک جن لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی، ان لوگوں کی فکری پالیسی نیتاجی سے میل نہیں کھاتی تھی۔ نیتاجی پیچھے مڑ کر دیکھنے کے قائل نہ تھے۔

کانگریس سے نکل جانے کے بعد وہ اپنی آئندہ یوجنا (منصوبہ) پر سوچ بچار کرنے لگے تھے۔ نیتاجی کا جیسا خیال تھا، وہ آخرکار سچائی میں بدلا۔ عالمی جنگ شروع ہو گئی تھی اور اس سے بھرپور اور خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی انکی خواہشیں بے چین ہو رہی تھیں۔ یورپ میں سفر کے دوران ان کی ملاقات کئی غیر ملکی سیاسی لیڈروں سے ہوئی تھی، جن میں چیکوسلاواکیا کے ڈاکٹر بینیس اور لندن کے کلیمنٹ اٹلی اور سر اسٹیفورڈ کرپس قابلِ ذکر ہیں۔ حالانکہ جرمنی میں ان کو ایسی کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل ہوئی تھی، پھر بھی وہ یورپ میں وہ اپنے موئدین کے چھوٹے چھوٹے گروہ قائم کر سکے۔ نیتاجی نے یورپ کے بڑے بڑے سیاسی زعماء کو اپنا ہم خیال بنایا اور انہیں بتایا کہ ہندوستان کی آزادی ان کے حق میں بہتر ہو گی، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا مطلب ہے برطانوی سامراج اسکی جارحیت اور استعماریت کا دنیا سے خاتمہ۔

بہرکیف ایسے خیالات، تصورات اور پھر عملاً اس میں حصہ لینا کچھ آسان کام نہیں تھا جرمنی کے نازیوں کے سوا کوئی دوسرا ملک یا قوم براہِ راست برطانیہ سے دشمنی مول لینی نہیں چاہتی تھی۔ یہ بڑا بھاری سیاسی مسئلہ تھا۔ ساتھ ہی تمام مغربی استعماریت پسند طاقتیں اس سے ہراساں تھیں کہ اگر برطانیہ کا آفتابِ اقبال غروب ہوا تو ان کے بھی سارے مقبوضات اور نوآبادیات کی خیر نہیں۔

یہ بڑا مشکل وقت تھا، جب کہ نیتاجی کو ہندوستان کی آزادی کے لئے دنیا کی دوسری حکمراں طاقتوں کی مدد اپنے حق میں حاصل کرنی تھی۔ انہیں اس کا پورا اندازہ تھا کہ برطانیہ سے عملاً مخالفت اور خاطر خواہ کچھ کام اسی وقت بن سکتا ہے جبکہ دنیا کی مختلف طاقتیں ان کے ساتھ تعاون کر سکیں ورنہ برطانیہ کا آسیب اتنی آسانی سے نہیں اتر سکتا۔ اس وقت تک برطانیہ بین الاقوامی بازار میں بھی اپنی پوزیشن مضبوط کر چکا تھا اور اپنی اقتصادی ناموازن صورتحال

پر قابو پا چکا تھا۔ ایسے میں یورپ کا کوئی بھی ملک بھارتی جنتا کی آزادی کی مانگ پر ہمدردی کا ایک لفظ بھی اس کے حق میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

حقیقتاً برطانیہ کے طاقتور ہوتے جانے کی وجہ سے ہندوستان کے حق میں دوسرے ملکوں کی ہمدردی کے مواقع کم سے کم ہوتے چلے گئے۔

حالات کے مخالف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "راشٹریے سماج واد" اور "اطالوی فاشزم" کی زبوں حرکتی نے دنیا کو گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ ایسے میں جرمنی اور اٹلی کی ہندوستان کی آزادی کے لئے ہمدردی کرنے کا مطلب تھا، دیگر ملکوں کا بھارت کے مخالف ہو جانا۔ اس موقع پر سوویت روس کے سوا یورپ یا ایشیا کا کوئی دوسرا ملک ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

ہندوستان کی سرحد کے باہر

سوویت روس کی یہ دلچسپی پونجی واد کے خلاف عالمی انقلاب کرانے کے منشا کے چلتے محض ہندوستانی بورژواؤں کو ڈرانے کے سوا اور کسی طرح کی کامیابی نہیں حاصل کر سکی۔ الٹے کمیونسٹ انقلاب کے نتیجے سے یوروپین ملکوں کی ہمدردی بھی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ نیتاجی کے لئے یہ وقت بہت ناموافق تھا۔

دراصل جنگی مدد مانگنے میں ان کی ہچک کی کچھ وجہیں تھیں۔ اوّل تو اب تک "راشٹریے سماج وادیوں" سے ان کی کوئی ملاقات نہیں تھی، اور سفر یورپ کے دوران جرمن افسروں سے ملاقات کی ان کی مہم ناکامیاب رہی تھی۔ حقیقتاً، وہ جرمن راشٹریے سماج وادیوں کی بھارت کے آزادی کے مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہ لینے سے ناامید ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی یہ ناامیدی جرمنی کی .... اکادمی نام کے ایک ادارے کے صدر ڈاکٹر تھیبر فیلڈر کو لکھے ایک خط سے ظاہر کی تھی۔ اس خط میں بھارتیوں پر ہٹلر کی تنقید کے سلسلے میں انہوں نے ناراضگی ظاہر کی تھی۔ یورپ کے سفر سے ہندوستان لوٹنے کے بعد نیتاجی نے جرمن۔ تعاون کے مسئلہ پر سوچنا لگ بھگ بند کر دیا تھا۔ لیکن جرمنی اور برطانیہ کی بالامکان جنگ میں انہوں نے ایک ایسا موقع دیکھا تھا کہ جس سے انگلستان پر بھارت کی آزادی کے لیے دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ یوں نیتاجی کو اس بات پر بھی پوری طرح یقین نہیں تھا کہ جرمنی کے "راشٹریے سماج وادی" ہندوستان کی آزادی کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی طرح کی مدد دے ہی دیں گے، لیکن ان کا ماننا تھا کہ کچھ بھی ہو اس جنگ کے نتیجے میں انگریزی فوج کی طاقت ضرور کمزور ہو جائے گی، جو آخرکار ہندوستان کے حق میں ہی جائے گی۔

دراصل نیتاجی کی دلچسپی جرمنی کے "راشٹریہ سماج واد" میں نہ ہوکر اس جنگ میں تھی، جو دو طاقتور سماج وادیوں کے درمیان چھڑی تھی۔ ایسے میں یہ طے تھا کہ ان ملکوں کے ماتحت ملکوں کو کم و بیش فائدہ ضرور ہو سکتا تھا۔ نیتاجی کے سامنے تاریخ کی ایسی کئی مثالیں تھیں، جب بڑے سامراجوں کے خاتمہ پر ان کے ماتحت یا غلام ملکوں کی آزادی بحال ہوئی تھی۔ نیتاجی تاریخ کی عالمانہ واقفیت رکھتے تھے۔ انہیں روم کی تاناشاہی کے زوال سے دیگر ملکوں کی خوشحالی اور فروغ یابی کے اسباق اچھی طرح یاد تھے۔

نیتاجی کے سامنے ایک نئے راستے کے انتخاب کی کٹھن گھڑی تھی۔ وہ دنیا کے موجودہ حالات کی تھاہ لیتے ہوئے اپنا راستہ طے کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے حادثوں کا صحیح صحیح جائزہ لیا جائے۔

تاریخ کے سبق

ہندوستان کی سرحد کے باہر کے واقعات کی بھرپور واقفیت آسانی سے ہو جانی ممکن نہیں ہو پا رہی تھی۔ عام ہندوستانی عوام ایسی تمام معلومات سے تقریباً نابلد تھے لیکن نیتاجی دنیا پر چوکس نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہیں حاصل ہونے والی معلومات کے اپنے طریقے تھے۔ پولینڈ کی ہار اور اس پر جرمنی کا قبضہ، سوویت روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ کا بٹوارہ اور جرمن سپاہ کے ذریعہ چیکوسلاواکیہ کے بعد ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ اور بلجیم پر قبضہ دنیا کی نیرنگیوں کا واضح اور صریح نقشہ نظر کے سامنے تھا اور ان حالات سے نیتاجی کے دل میں فیصلہ کا رخ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ جرمن فوج کے جنگی حملوں نے فی الحال ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ یورپ پر دہشت طاری ہو گئی تھی۔ وقت کے اس رخ کا ہندوستان میں لوگوں کو خاص اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی لوگ حالات کی ایسی نزاکت اور اہمیت کو سمجھ پا رہے تھے۔

ہاں سبھاش چندر بوس اور جواہر لال نہرو ہی دو ایسے قومی رہنما تھے، جو یورپ میں ہونے والی جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل سے واقف تھے لیکن فکری اختلاف کے سبب پنڈت نہرو جرمنی سے ہمدردی کے حمایتی نہ تھے۔ یہ آزادی اور جمہوریت کے جذباتی دائرے سے نکل نہیں پائے تھے۔ ظاہراً یہ جرمنی کے مخالف رہے۔ نیتاجی اس جنگ کو دوسری نظر سے دیکھ رہے تھے اور انہیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ اس میں جرمنی یا برطانیہ کا انجام کیا ہوگا؟ وہ تو محض یہ دیکھ رہے تھے کہ ان حالات کا ہندوستان پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ انہوں نے دیکھا کہ جنگ کی اس افراتفری میں برطانیہ اپنے جزیرے میں الگ تھلگ پڑ کر بری طرح گھر گیا تھا اور اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا نیتاجی کا مقصد تھا۔

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ نیتاجی دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور یہی جنگی پالیسی "آزاد ہند فوج" کے وجود میں آنے کی وجہ بنی۔ لڑائی کے متعلق عملی رویّہ اور اس کے انجاموں کا تجزیہ دو ایسی حقیقتیں تھیں جن کے چلتے نیتاجی اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے برطانیہ کے دشمن ملکوں کا تعاون اور ہمدردی حاصل کی جائے۔ نیتاجی کا خیال تھا کہ کسی بھی ملک پر کسی غیر ملک کی حکومت کا مطلب ہے اس کی فوجی طاقت کا مضبوط ہونا۔ یہ سچائی ہندوستان پر انگریزی حکومت کے لیے بھی لاگو ہوتی تھی۔ دراصل ایک لمبے عرصے سے ہندوستان پر قابض انگریزی حکومت کے چلتے عام ہندوستانی یہ بھول گیا تھا یا ماننے کو تیار نہیں تھا کہ بیتے ہوئے وقت ہندوستان کی سرزمین پر برطانوی حکومت کے قائم ہونے کی وجہ تھی ہندوستانی فوجی طاقت کی شکست و ریخت۔ حقیقتاً انگریز "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے پردے میں بھارت پر فوجی گرفت مضبوط کرنے میں کامیاب رہے۔ بہت کم لوگ تھے جو ایسی معمولی مگر واضح تاریخی حقیقت سے آشنا تھے کہ انگریزی حکومت کا استحکام محض اس کی فوجی طاقت پر قائم ہے اور سے متصادم ہونا ضروری ہے ایسے نازک اور باموقع وقت پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے محض اس امید پر بیٹھا نہیں رہا جا سکتا تھا کہ بالآخر خود ایک نہ ایک دن انگریز ہندوستان کی آزادی تسلیم کر لیں گے۔ یہ محض ایک سراب تھا۔

نیتاجی گھر سے غائب

نیتاجی اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ کوئی ملک اپنی آزادی تب تک حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ بدیسی حکومت کی فوجی طاقت پامال نہ کی جائے۔

جس طرح نیتاجی سوچ رہے تھے لگ بھگ ویسے ہی خیالات دوسرے بھارتی انقلابیوں کے بھی تھے۔ ایسے لوگوں کی تشددانہ تحریک سے عقیدت ختم ہو چکی تھی۔ نیتاجی کی غیر تشددانہ تحریک سے مخالفت کو لوگوں نے ان کی گاندھی جی سے حریفانہ اقدام پر محمول کیا تھا۔ مگر حق تو یوں ہے کہ نیتاجی نے کانگریس کے خاص خاص نیتاؤں اور ان کی گاندھی وادی نیتی کو قطعی تسلیم نہ کیا بلکہ گاندھی جی سے جو ان کی ملاقات ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود گاندھی جی بھی غیر تشددانہ طریقۂ کار سے کسی حد تک بدظن ہو گئے۔ دراصل نیتاجی کا خیال تھا کہ وہ اس وقت تک انتظار کریں گے، جب تک کہ اجتماعی تحریک قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ طے تھا کہ اس کے بعد آندولن کی قیادت انقلابی نیتا لے لیتے، جو انگریزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے کھدیڑنے میں متفق ہوتے۔ نیتاجی یہ مان کر چل رہے تھے کہ اگر وہ "آزادی ـــــ آندولن" کی طوالت بدل دینے کے لیے انگریزی حکومت کی مخالف بیرونی طاقتوں سے تال میل بٹھالیں، تو ملک کی کئی اندرونی طاقتیں انگریزوں سے سیدھے بھڑ جائیں گی۔ یہ طریقہ ہندوستانی عوام کو نفسیاتی

جھٹکا دینے میں بھی کامیاب ہوتا اور ملک ایک نئی طاقت کے ساتھ آزادی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ نیتاجی جانتے تھے کہ کام میں جوکھم ہے' لیکن بغیر جوکھم اٹھائے' یہ جنگ جیتنا ممکن نہیں تھا۔ اور آخر کار نیتاجی نے جوکھم اٹھانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ دل و دماغ میں جاری اس کشمکش نے جب تک اپنا مقام طے کر لیا تھا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ "بھارت رکشا قانون" کے تحت ان کی گرفتاری کے بعد دسمبر ۱۹۴۰ء کی رہائی ان کی نئی زندگی کی شروعات تھی۔ رہائی کے بعد وہ اپنے کلکتہ کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ لیکن ایک طرح سے وہ اپنے گھر میں بھی نظر بند تھے۔ ان کا کسی بیرونی آدمی سے ملنا جلنا ممکن نہیں تھا۔ ان پر ہر طرح خفیہ نظر رکھی جا رہی تھی۔ خفیہ پولیس کے سو جوان لگاتار ان کی نگرانی پر تیار تھے۔ اپنی رہائی کے بعد نیتاجی پوری طرح گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگوں نے سنا کہ وہ دن رات پوجا پاٹھ کر رہے ہیں اور اب انہیں سیاسی اور دنیوی معاملوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ یقیناً یہ لوگوں کے لیے حیرت انگیز خبر تھی۔ کوئی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ نیتاجی جیسا جیوٹ کا آدمی یک بیک اس قدر تبدیل ہو گیا؟ یہ تو فراریت کا طریقہ معلوم ہوتا تھا! لیکن اس کے آگے پیچھے نیتاجی کے بارے میں کہیں کوئی صحیح واقفیت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہر طرف سے صرف اٹکل اور غیر معتبر خبریں مل رہی تھیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۴۱ء کی صبح، صبح لوگوں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی "سبھاش چندر بوس اپنے گھر سے غائب"۔ یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ پہلے لوگوں کو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا لیکن سچائی جب اچھی طرح ظاہر ہو گئی تو افواہوں کا بازار گرم ہو گیا۔ کچھ لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ نیتاجی سادھو ہو کر ہمالہ کی طرف چلے گئے۔ یہ اس لئے بھی شک ہوا کہ نیتاجی کا بچپن ہی سے دھرم کی طرف جھکاؤ تھا۔

نیتاجی نے مجھے بتایا

ہندوستان میں جب افواہوں اور اٹکلوں کا بازار گرم تھا اور لوگ یہ مان چکے تھے کہ نیتاجی نے سنیاس لے لیا ہے' اس وقت یک بیک لوگوں تک یہ حیرت انگیز خبر پہنچی کہ نیتاجی ہندوستان کی سرحد سے باہر جا چکے ہیں۔ یہ خبر سچ تھی۔ نیتاجی جیسا جیوٹ کا آدمی سنیاسی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی راہ الگ تھی اور وہ اس راستے پر بہت دور نکل چکے تھے۔

وہ مارچ ۱۹۴۳ء کا مہینہ تھا۔ ایک دن فرصت کے وقت میں نے خود نیتاجی سے اصرار کیا تھا کہ وہ ہندوستان سے نکل بھاگنے کی کہانی کے بارے میں کچھ وضاحت فرمائیں اور یہ میری خوش نصیبی ہے نیتاجی نے وہ کہانی مجھے خود سنائی' جسے اس وقت دنیا سننے کے لیے بے تاب تھی۔ نیتاجی کے ساتھ اس لرزہ خیز لمحہ کو آج بھی نہیں بھول پایا ہوں' لگتا ہے اس کہانی کے لفظ لفظ میرے کانوں میں آج بھی گونج رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا

ہے وہ عظیم شخصیت آج بھی میرے قریب بیٹھی ہوئی اپنی داستان بیان کر رہی ہے" میں بھارت سے باہر جانے کے لیے بہت بے چین تھا کیوں کہ بھارت سے باہر جا کر ہی صحیح معنوں میں بھارت کی خدمت کر سکتا تھا۔ مجھے روس میں کچھ ایسے لوگ ملے تھے جنہوں نے اس معاملہ میں مجھ سے تعاون کا پورا وعدہ کیا تھا، لیکن تب میں یہ فائدہ نہ اٹھا سکا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا تو یہ کہ مجھے کلکتہ کارپوریشن کے بہت ضروری کام نپٹانے تھے اور دوسرا یہ کہ میرے چہرے پر اس وقت داڑھی نہیں تھی، جو مجھے باہر نکل بھاگنے میں مددگار ہوتی — وہ آدمی جو میرے ساتھ کابل تک گیا تھا، اس کا یہاں کے سوویت سفارت خانے میں اچھا رسوخ تھا۔

"کلکتہ کارپوریشن کے سارے کام نپٹانے کے بعد میں نے بلا پس و پیش یہ ظاہر کر دیا کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خبر اڑ گئی کہ میں روحانی ریاضت میں منہمک ہوں اور اس دوران میرا کسی سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے تمام افراد کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ لوگ یہ کوشش کرتے رہیں کہ کوئی مجھ سے ملنے نہ آئے۔ اگر بہت ضروری ہو تو ٹیلیفون پر بات چیت کی جا سکتی تھی۔

"یہاں تک کہ میں نے اپنے گھر آنے والے مہمانوں سے بھی ملنا بند کر دیا تھا۔

"میں نے ۵ر دسمبر ۱۹۴۰ء سے اپنی داڑھی بڑھانی شروع کر دی تھی اور یہ سلسلہ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۱ء تک چلتا رہا۔ محبوب! ان چالیس دنوں کے دوران میری بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر مجھے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ دراصل، میں نے اپنے سارے عزائم پوشیدہ رکھے تھے اور پوری طرح مطمئن تھا کہ میرے بارے میں اب کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی سے واقفیت کا مطلب تھا کہ میرے غائب ہونے کے بعد سرکار یہ پتہ لگا لیتی کہ میں کسی اسلامی ملک کی طرف فرار ہوا ہوں اور اس ملک میں میرا سراغ لگا لینا کچھ مشکل نہ ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے عزم و اقدام پر بہت سوچ بچار کر کے عمل پیرا تھا۔ میں اپنے مکان کے جس کمرے میں تنہائی کے دن گزار رہا تھا، وہ کافی وسیع و عریض تھا۔ ۴ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو ہی میں نے اس کمرے کو ایک پردے کے ذریعہ دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس انتظام کے بعد میں نے گھر میں یہ اعلان کر دیا کہ پچھلے حصے میں میں پوجا پاٹ اور آرام کرتا ہوں ادھر کوئی نہیں آ سکتا۔ سامنے والے حصے میں آنے کی اجازت میں نے اپنی چودہ سالہ بھتیجی کو دے دی تھی۔ وہی مجھے کھانا، پانی، اور دوا وغیرہ دے جاتی تھی۔

اس بہادر لڑکی کے نام

وہ اپنے چچا یعنی میرے لیے جو چیزیں دینی اسے ایک ٹرے میں رکھ کر پردے کے نیچے سے دوسری طرف ٹھیل دیتی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی پیغام بھی دینا ہوتا

تو ایک پرزے پر لکھ کر ٹرے کے ساتھ ہی بھیج دیتی تھی۔ یہ سلسلہ قریب چالیس دنوں تک چلا۔ ۱۵ ار جنوری ۱۹۴۱ء کا دن تھا جب میری بھتیجی میرے لیے دوپہر کا کھانا لے کر آئی، تو میں نے بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا، بیٹی میری پیاری بیٹی، آج میں تمہیں کچھ خاص بات بتا رہا ہوں۔ اسے دھیان سے سنو اور آج رات سے ہی اس پر عمل کرنا شروع کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو گی۔"

نیتاجی اس وقت ایک پل کے لیے رُکے تھے، جیسے ماضی میں کھو گئے ہوں۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا تھا — "میں نے اپنی بھتیجی کو بتایا کہ میں ۳۶ گھنٹے بعد کلکتہ چھوڑ دوں گا اور پیشاور، کابل ہوتے ہوئے بدیش چلا جاؤں گا۔ بدیشوں میں میں ان نیتاؤں سے رابطہ قائم کروں گا جو گوری حکومت سے برسرپیکار ہیں۔ میں وہاں بھی انگریزوں کے خلاف مورچے تیار کروں گا اور لندن سرکار کی نیند حرام کر دوں گا۔ بیٹی، میں نے بھارت سے بھاگنے ہی کے لئے اپنی ڈاڑھی بڑھائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس شکل میں مجھے کوئی پہچان نہیں سکے گا۔"

"بیٹی، تمہیں یہ ساری باتیں ۳۶ گھنٹے تک کسی کو نہیں بتانی ہے۔ ہاں، تم رات کا کھانا اور دوسرے دن کا کھانا وقت پر میرے کمرے میں پہنچا دینا لیکن یہ بات کسی کے کان تک نہیں پہنچنی چاہیے کہ میں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟ جب تم دوسری رات کا کھانا لے کر جاؤ گی، تب اس کے بعد اپنی دادی یعنی میری ماں کو جا کر بتا دینا کہ چچا کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ کل سے کھانا نہیں کھا رہے ہیں۔

" محبوب! میری بھتیجی میرے طے شدہ منصوبے کو بڑے غور سے سنتی رہی۔ آخر میں میں نے اسے سمجھایا۔ بیٹی، گھر میں میرے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں تم میری مدد کرو، باہر تھوڑی دیر تک تمہارا بھائی ڈاکٹر شیشر کمار بوس، (موجودہ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بنگال) میری مدد کرنے کو تیار ہے۔

"میری باتیں سن کر، میری بیٹی نے جو جواب دیا اس سے میرا سر فخر سے تن جاتا ہے! محبوب! اس نے کہا تھا — "چچا، آپ صرف میرے چچا ہی نہیں بلکہ سارے دیش کا بیٹا، بھائی، سپاہی، رہنما اور قائد ہیں۔

میں آزادی لے کر لوٹوں گا

"اگرچہ آپ اپنی بیٹی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ماں کالی آپکے منصوبے کو کامیاب بنائے گی۔ پتہ نہیں پھر آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو، اس لئے اس بیٹی کو اپنے گلے سے لگا لیجیے۔" محبوب! یہ کہتے کہتے میری بیٹی بلک بلک کر رونے لگی۔ اس معصوم بچی کا رونا دیکھ کر خود میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے کہا تھا — میری بہادر بیٹی، میں بہت ہی جلد تمہارے لئے آزادی لے کر لوٹ رہا ہوں۔ تم ہمت سے کام لو۔

"آخر میں میری بھتیجی، میری صرف وہی ایک راز دار، وہ ننھی سی گڑیا میرے پیر کو چھو کر پرنام کرنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔

"اور اس کے بعد وہی ہوا جس کا ہونا طے تھا۔ اگلی صبح میرے گھر سے غائب ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ان چھتیس گھنٹوں کے درمیان مجھے بہت دور نکل جانے کا موقع مل گیا تھا۔"

——— میں نیتاجی سے یہ سب سن کر دنگ رہ گیا تھا اور اس وقت بھی میرے دل و دماغ میں اس ننھی سی گڑیا کے متعلق عجیب عجیب تصورات ہیں، عقیدت کے جذبات ہیں۔ یادداشت پر لاکھ زور دینے کے باوجود اس وقت بھی مجھے نیتاجی کی اس بھتیجی کا نام یاد نہیں آرہا ہے لیکن میرے لیے ہندوستان کا ہر بچہ، ہو لڑکی کے لیے سوچتا ہے، عقیدت کا پیکر ہے۔ میں ہر ایسے لخت جگر کے لیے دعا کرتا ہوں۔

نیتاجی کی اس بھتیجی کا ذکر کرنے میں مورخوں نے اکثر کوتاہی کی ہے۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ ہم جنہیں غیر ضروری سمجھتے ہیں اور نظر انداز کر دیا کرتے ہیں، وہ بڑی اہم چیز ہوتی ہے جبکہ اس کی حیثیت واقعات کی کڑیوں میں ناقابل اعتنا ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں نیتاجی کی راز دار اس ننھی سی جان کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر وہ نادانی میں ہی سہی نیتاجی کے گھر سے غائب ہونے کی خبر کو فوراً کسی کو بتا دیتی، تو پھر کیا ہوتا؟ ایک ذرا سی غلطی، آزاد ہند فوج کے وجود کو شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گمنامیوں میں مدفون کر دیتی! لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں اس بہادر لڑکی کو جب وہ ذہن میں آتی ہے آج بھی دعائے خیر سے یاد کرتا ہوں۔

۱۴؍ جنوری ۱۹۴۱ء کی آدھی رات کو نیتاجی نے اپنا عزیز گھر چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ مولوی کے بھیس میں تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بھتیجہ شیشر کمار بوس تھا۔ خاموش رات کی اس تاریکی میں آناً فاناً نیتاجی کا سامان موٹر میں رکھا گیا اور پھر ایک نامعلوم منزل کا لامتناہی سفر تھا اور وہ عظیم ترین انسان! نیتاجی چھپتے چھپاتے کلکتہ سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر گومو ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ گومو پہنچنا اس لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ہاوڑہ سے ریل میں سوار ہونا نامناسب سمجھتے تھے۔ کلکتہ کے گھر گھر میں ان کی تصویر موجود تھی اور عین ممکن تھا کہ داڑھی بڑھا لینے کے باوجود وہ کہیں کسی وقت بھی پہچانے جا سکتے تھے۔

سفر در سفر

گومو پہنچ کر انہوں نے اپنے بھتیجے کو الوداع کہا۔ گومو جنکشن پر پہنچتے ہی انہیں اندازہ لگ گیا کہ ان کے غائب ہونے کی خبر پھیل چکی ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے چپے چپے پر انگریزی پولیس اور سراغ رسانوں کی نگراں نظریں اس بات کی شاہد تھیں کہ ان کی غیبت نے انگریز حکومت کو ہراساں کر دیا ہے۔ پولیس اور خفیہ محکمے کے جوان بڑی مستعدی سے نگراں تھے اور ہر آنے جانے والی ریل گاڑیوں کے جائزے لے

رہے تھے ۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے ۔ نیتاجی گوموسے پیشاور جانے والی ریل گاڑی کے دوسرے درجے میں سوار ہوئے تھے ۔ ٹھیک سوا آٹھ بجے خفیہ پولیس نے گاڑی کی تلاشی لینی شروع کردی تھی ۔ اس کے آگے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے نیتاجی نے خود بتایا "پیشاور ایکسپریس کے ایک کونے میں مجھے بیٹھنے کیلئے ایک سیٹ مل گئی تھی ۔ میرے بیٹھنے کے پانچ منٹ بعد ہی پولیس نے ہر ڈبے میں میری کھوج شروع کردی ۔ میرے ڈبے کے ٹھیک سامنے دھنباد ۔ رانچی رینج کے آئی ۔ جی (سی ۔ آئی ۔ ڈی) آکر کھڑے ہوگئے ۔ اس آئی ۔ جی کی خاص طور پر تعیناتی کی گئی تھی ۔ اس آئی ۔ جی نے وہیں کھڑے کھڑے ہر ڈبے میں پولیس کے پانچ چھ جوانوں کو بھیجنے کے بعد اپنے ایک جونیر پولیس افسر سے کہا ۔ تم سبھی لوگ پلیٹ فارم پر ہر آنے جانے والے پر نظر رکھو ۔ اس ڈبے کی تلاشی میں خود لوں گا ۔ یہ سب میں بڑے غور سے سن رہا تھا اور اپنے کمبل میں دبکا ہوا آنے والی گھڑی کا تصور کرکے لرز اٹھا تھا ۔ خود آئی ۔ جی کے ذریعے اپنے ڈبے کی تلاشی لینے کی بات سُن کر ایک پل کو میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں لیکن دوسرے ہی پل انجن کی تیز سیٹی کے ساتھ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا ۔ تمام پولیس کے جوانوں کو ڈیوٹی سونپ کر آئی ۔ جی صاحب خود میرے ڈبے میں داخل ہوئے ۔ یہ سب دیکھ کر میری دھڑکن تیز ہوگئی ۔ آئی ۔ جی صاحب نے کچھ لوگوں کی تلاشی لینی شروع کی ۔ ان کی متجسس اور تیز نگاہیں ہر آدمی کا ایکسرے کررہی تھیں ۔ پورے ڈبے میں عجب سراسیمگی کا عالم تھا ہر فرد پر دہشت کے آثار نمایاں تھے ۔ خاموشی کی گھٹی گھٹی سی فضا تھی ۔ کچھ لوگوں کی تلاشی لینے کے بعد آئی ۔ جی صاحب ڈبے سے نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹھیک اسی جگہ پہنچ گئے جہاں وہ پہلے کھڑے تھے ۔ اپنی جگہ پر کھڑے ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ٹک میری طرف دیکھنا شروع کردیا ۔ ان کی آنکھوں کی تیز شعاعیں میرے دل میں اتر رہی تھیں میں بڑی امید و بیم کے عالم میں تھا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی حالت تھی ۔ محبوب ! تمہیں جان کر حیرت ہوگی کہ انجن کی آخری سیٹی دینے پر میری گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کے ساتھ ہی اس آئی ۔ جی نے مجھے سیلوٹ کیا تھا اور مسکرا پڑا تھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس وقت وداع ہوتے ہوئے جیسے اشارے سے کہہ رہا ہو ، جاؤ میرے دوست ، وطن کو جلدی آزاد کراؤ " اس واقعہ کا ذکر کرتے کرتے نیتاجی کی آواز بھر آگئی ۔ ایسا لگا اس آئی ۔ جی کے وطن پرستی کے جذبوں نے انہیں اس وقت حد درجہ متاثر کردیا تھا ۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا " محبوب ! میں نے اسی وقت گوموجنکشن پر سوچ لیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی اب کسی کے روکے نہیں رک سکے گی " لیکن آج میں کرنل محبوب ! یہ سب دیکھ کر اور سوچکر

دنگ ہوں کہ موجودہ ہندوستان کتنی منڈلیوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ یہ سوال مجھے بار بار پریشان کرتا ہے کہ نام، مذہب اور ذات سے پرے وطن پرستی کا وہ جذبہ کہاں دفن ہو گیا۔

حفاظت کا یہی تقاضا تھا

نیتا جی نے آگے بتایا کہ احتیاط کے لحاظ سے ہم نے کابل ندی چمڑے کے تھیلوں کے سہارے پار کی۔ اس پار پہنچنے پر بڑی دیر تک ہم کسی سواری کا انتظار کرتے رہے۔ کافی رات آجانے پر بڑی مشکل سے ایک کھلی ٹرک ملی۔ ہم لوگ اسی ٹرک پر بیٹھ کر آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ کڑاکے کی سردی، برفانی فضا اور رات کا سفر! چاروں طرف برفباری ہو رہی تھی۔ ایسے میں ہمارے پاس ایک بھی گرم کپڑا نہیں تھا۔ بکسوں سے لدی ہوئی ٹرک پر ہم لوگوں نے ٹرک کے سب سے اونچے حصے پر بیٹھ کر ساری رات گزار دی"۔

"دوسری رات ہم لوگ بھٹ کاک میں تھے۔ یہاں افسروں نے ہم سے پاسپورٹ مانگے۔ رحمت خاں نے لال پوراں کے مکھیا کا دیا ہوا خط افسروں کو دکھلایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ میرا بھائی گونگا اور بہرا ہے۔ لیکن وہ افسر راضی نہ ہوا۔ آخرش اسے منانے کے لیے دو روپے دیئے۔ بعد میں اس نے میری کلائی میں بندھی گھڑی بھی مانگ لی۔

"تقریباً چار پانچ بجے دن میں ہم کابل پہنچے۔ اس ٹرک نے ہمیں لاہور گیٹ پر اتار دیا جہاں سے ہم ٹھہرنے کے لیے کسی مقام کی تلاش میں چل پڑے۔ اس وقت کابل میں موسم بہت خوشگوار تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہمیں ٹھہرنے کی جگہ مل گئی۔ محبوب! اس وقت باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دروازہ کھلا رکھنا ممکن نہ تھا، جب کہ کوٹھری میں دھواں بھر رہنے کی وجہ سے دم بھی گھٹ رہا تھا۔ ہم نے اپنا جسم گرم رکھنے کے لئے کچھ لکڑی کے کندے اکٹھے کر کے جلا لیے تھے۔ شام کو بھگت رام بازار سے کھانے کے لیے سوکھی روٹیاں اور کباب لے آیا۔ ساتھ ہی روشنی کے لیے کچھ موم بتیاں بھی"۔

کابل میں زیادہ دن تک ٹھہرنا نیتا جی کے لیے مناسب نہ تھا۔ حالانکہ افغانستان ایک آزاد ملک تھا۔ لیکن وہاں کی حکومت پر انگریزوں کا اچھا خاصا اثر برقرار تھا۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جتنا جلد ہو سکے وہ کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں۔ حفاظت کا یہی تقاضا تھا۔ دراصل نیتا جی روس جانے کی سوچ رہے تھے۔ اس سلسلے میں لگاتار تین دن تک کابل کے روسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی، مگر کام نہیں بن پا رہا تھا۔ دقت یہی تھی کہ نیتا جی یا بھگت رام میں سے کسی کو بھی روسی زبان نہیں آتی تھی۔ نتیجتاً، وہ

لوگ حالات کے باعث اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھے۔ ادھر کابل میں رحمت خاں کی پشتو زبان بھی کام نہیں آ رہی تھی۔ وہاں ان کا کوئی دوست بھی نہیں تھا۔ ظاہراً انہیں کسی طرح کی بیرونی یا اس وقت اور کوئی مدد ملنے کی امید نہ تھی نہ اس کا امکان تھا۔ ایسے میں کابل میں رہنا ان کے لیے ایک حد تک خطرناک ہو گیا تھا۔ جب تک کوئی امید افزا صورت حال پیدا نہ ہوا انہیں اپنی روپوشی اور حفاظت کی اشد ضرورت تھی۔ اس لیے رحمت خاں نے کابل کے ایک ایسے شخص کے بارے میں واقفیت حاصل کی جس کے مقامی رسوخ اچھے خاصے تھے۔ یہ ایک بیوپاری تھا۔ اُتم چند، اُتم چند خالص ہندوستانی تھے، لیکن عرصۂ دراز سے کابل میں مقیم تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بڑے وطن پرست تھے۔ رحمت خاں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور تعاون کی درخواست کی۔

کابل میں اُتم چند نے نیتاجی کی کس طرح حفاظت کی اور اس پوری مدت میں ان پر کیا گزری، یہ سارا واقعہ خود اتم چند سے مجھے اس وقت سننے کا موقع ملا جب ان سے میری ملاقات سنگاپور میں ہوئی تھی۔ وہ پورا واقعہ جوں کا توں میں یہاں اُتم چند کی زبانی پیش کر رہا ہوں۔

اُتم چند نے ان صبر آزما لمحات کو یاد کرتے ہوئے بتایا ــــــ "نیتاجی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۱ء کے دوران کابل میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے صرف ان کے بارے میں کچھ یونہی واقعات سنے تھے ۔ جانتے ہو محبوب! نیتاجی کی وہ ملاقات ایک تیز ہوا کے جھونکے کی طرح تھی۔ وہ ۱۹۴۱ء فروری کا مہینہ تھا ۔ اس دن میں اپنی دکان پر بیٹھا کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔ موسم بے حد سرد تھا۔ برفانی ہوا کے جھونکے موسم کو اور بھی قاتل بنائے ہوئے تھے۔ برفباری سے ساری سڑکیں اور مکانات برف کی سفید چادروں میں ملفوف تھے۔ ایسے ہی وقت میں میری دوکان پر ایک اجنبی پہنچا تھا۔ خاکی پشاوری شلوار، قمیص اور اس کے اوپر چمڑے کی جرکن اور کوٹ میں لیس وہ پٹھان نوجوان مجھ سے بے حد دھیمی آواز میں مخاطب ہوا تھا۔ کیا آپ کا نام اُتم چند ہے؟" میرے "ہاں" کہنے پر وہ اجنبی بڑے اطمینان سے مسکرایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اس دلیر دیوانے کو دیکھ کر

وہ اجنبی بغیر کچھ جواب دیے، آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینے لگا تھا، مجھے لگا وہ میرے ۱۵ سالہ نوکر امرناتھ کی موجودگی سے تذبذب میں پڑ گیا ہے ۔ میں اسے تاڑ گیا اور فوراً نوکر کو چائے لانے کے بہانے باہر بھیج دیا۔ نوکر کے جاتے ہی اس اجنبی نے بتایا ــــــ "میرا نام بھگت رام ہے۔ میں مردان ضلع کے گھلا دیر گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے ہی بھائی نے پنجاب کے گورنر کو گولی مار کر قتل کرنا چاہا تھا۔ اس انقلابی کا نام ہری کشن لال تھا۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میرے اس سوال کے جواب میں بھگت رام نے بتایا تھا ــــ "اس وقت ایک بے حد ضروری کام سے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ میرے ساتھ نیتاجی سبھاش چندر بوس ہیں۔ انہیں کسی طرح روس بھیجنا ہے۔" سبھاش بابو کا نام سن کر میں خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ بھگت رام بتا رہا تھا ــــ "اس وقت ہم لوگ ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور ہمارے پیچھے ایک افغانی خفیہ لگا ہوا ہے۔ یہ خفیہ پچھلے پانچ دنوں سے ہم لوگوں کو تنگ کر رہا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے، ہم اسے رشوت دیکر اپنی جان چھڑاتے ہیں۔ باوجود اس کے ہم اس سے کافی خوفزدہ ہیں۔ اس لئے ہم نے آپ سے ملنا ضروری سمجھا۔ ویسے میں آپ کے بھائی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوائیں، ہم آپ کے حد درجہ ممنون ہوں گے۔ ممکن ہے، آپ نیتاجی کو سرحد سے پار نکالنے میں خود کو مجبور پائیں، لیکن ہماری حفاظت اور نیتاجی کے روس جانے کا بندوبست آپ ضرور کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم کابل چھوڑ دیں۔"

"بھگت رام کی بابت میں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس کی تقریر جاری تھی۔" حالانکہ میں نے سوویت سفیر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن ابھی تک خاطر خواہ کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ یوں ہم نے اطالوی سفارت خانے سے بھی رابطہ قائم کیا ہے۔ اطالوی سفیر نے وعدہ کیا ہے کہ انتظام ہوتے ہی سبھاش بابو کو روم یا برلن بھجوا دیا جائے گا۔ بایں ہمہ ہمیں پہلی فکر اپنی حفاظت کی ہے جو نہایت ضروری ہے۔ ہمیں یہاں تب تک رہنا پڑے گا، جب تک کہ باہر نکل جانے کا پختہ انتظام نہیں ہو جاتا ہے۔"

بھگت رام کی ساری باتیں سن کر میں نے ایک پل کو سوچا، پھر کہا ــــ "میرے گھر میں آپ کے لیے خوش آمدید ہے لیکن یہ بتا دوں کہ میرے گھر میں میرے علاوہ ایک کرایہ دار بھی رہتا ہے۔ وہ مکان کے نچلے حصے میں ہے، اور میں اوپر کی منزل پر، ساتھ ہی میرا مکان گندے محلے میں ہے۔" ذرا تامل کے ساتھ میں نے بتایا ــــ بھگت رام نے مسکراتے ہوئے کہا "گندگی اور سیلن کی ذرا بھی فکر نہ کریں۔ ہمیں صرف ایک محفوظ جگہ چاہیے۔"

آخر کار یہ ہوا کہ بھگت رام، شام کے چار بجے سبھاش بابو کو لے کر آئے گا۔ بھگت رام رخصت ہونے لگا تو میں نے پوچھا "کیا میں تمہیں اسی نام سے پکاروں گا؟"

اس نے جواب دیا "نہیں، میرا نام رحمت خاں اور سبھاش بابو کا نام ضیاء الدین ہے۔" محبوب! دل کی بات کہوں! رحمت خاں عرف بھگت رام کے جانے کے بعد کافی دیر تک میں خوف اور وحشت محسوس کرتا رہا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ سبھاش بابو میرے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں، تو پھر کیا ہوگا۔ میری حالت خراب

ہوتی جارہی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس وقت اپنی بیوی بچّوں کے بارے میں اور ان کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھا! لیکن جلدی ہی خود پر قابو پالیا اور سر جھٹک کر بے بنیاد وسوسوں کو دل سے نکال باہر کیا۔ اس دن بڑی بے صبری سے پھر چار بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک چار بجے رحمت خاں نمودار ہوا۔ وہ تنہا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا —— سبھاش بابو کابل ندی کے کنارے کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ندی میری دوکان کے نزدیک بہتی تھی۔ رحمت سے سبھاش بابو کے بارے میں سن کر میں فوراً دوکان سے چل پڑا۔ ہم دونوں نے ندی پر بنے پل کو پار کیا۔ نیتاجی پل کے پاس نہیں ملے۔ ہم تھوڑی دور آگے بڑھے تو رحمت نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا نہایت گندی قمیص اور شلوار پہنے ایک پٹھان ہماری طرف تاک رہا ہے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ” سڑکوں پر برف جم جانے سے بڑی مصیبت ہے“ رحمت نے بتایا۔ یہی ہیں سبھاش چندر بابو، ایک پل کے لئے میں دنگ رہ گیا۔ ہندوستان کا محبوب اور جانباز لیڈر میرے سامنے کیسی بدتر حالت میں تھا۔ میں نے اسے سنبھالا۔ سبھاش بابو کو اس حال میں دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ملک کی آزادی کے لئے دربدر بھٹکنے والے اس قائد، رہنما اور دیوانے کے لیے میری عقیدت میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ میں ان دونوں کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سڑک بڑی خراب اور ناہموار تھی۔ جگہ جگہ بڑے —— بڑے گڑھے تھے۔ سبھاش بابو کئی بار ان گڑھوں میں پھنس گئے۔ اسی درمیان میں ہم لوگوں نے طے کیا کہ ہم تینوں ایک ایک کر کے آگے بڑھیں، تاکہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔

برلن انتظار کر رہا ہے

”میں سب سے آگے چل رہا تھا۔ میرے پیچھے تھے رحمت خاں اور ضیاء الدین یعنی نیتاجی سبھاش چندر بوس۔ اپنے گھر پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ کرایہ دار نے اپنی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر رکھے ہیں۔ پاس کی سڑک سے اِکّے دُکّے لوگ گزر رہے تھے۔ حالات متوازن تھے۔ میں ان لوگوں کو لے کر گھر میں داخل ہوا۔

” تھوڑی دیر بعد نیتاجی نے کپڑے بدل لیے۔ چشمہ لگا لیا۔ ڈاڑھی بڑھی ہونے کے باوجود وہ پہچانے جاتے تھے۔ میں نے دیکھا ان کے چہرے پر دلجمی اور طمانیت کے آثار ہیں۔ فوراً چائے ناشتے کا انتظام کیا۔ چائے پی کر انہوں نے تازگی محسوس کی۔ رحمت خاں کو میرے نوکر کے ساتھ سرائے سے سامان اٹھالانے کی ہدایت دیتے ہوئے نیتاجی نے کہا ’ سارا کام خفیہ لوگوں سے بچ کر بڑی ہوشیاری سے کرنا“ نوکر کے ساتھ رحمت خاں کے جانے کے بعد میرے گھر میں واویلا مچ گیا۔ دراصل، ہماری رازدارانہ حرکتوں کو بھانپ کر میری بیوی نے مخالفت شروع کردی۔ اس نے ایک ساتھ مجھ سے کئی سوالات کر ڈالے —— ” یہ اجنبی کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟

ہنارو ہوکر بھی انہوں نے اپنے نام کیوں بدل ڈالے ہیں؟ اور آپ اپنے گھر میں انہیں پناہ دینا کیوں چاہتے ہیں؟ اس کی پریشانی جائز تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے اس کا ڈرنا اپنی جگہ واجب تھا، لیکن نیتاجی کی حفاظت کے خیال سے میرا خاموش رہنا بھی ضروری تھا۔ بڑی مشکل سے میں اسے راضی کر سکا کہ میں تھوڑی دیر بعد اسے سب کچھ بتا دوں گا۔"

"بہر حال، رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگوں نے ریڈیو کی خبریں سنیں۔ ۱۹ر جنوری سے نیتاجی نے نہ ریڈیو سنا تھا نہ اخبار کی خبریں پڑھی تھیں، میں نے انہیں پچھلے ہفتے کی خبر سے واقف کرایا۔ نیتاجی کو گرفتار کر لیے جانے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس خبر پر انہیں ہنسی بھی آئی۔ محبوب! جب دنیا میں نیتاجی کے بارے میں طرح طرح کی اٹکلیں لگائی جا رہی تھیں، ٹھیک انہی دنوں وہ میرے گھر میں ایک مہمان کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ میری بیوی اپنے گھر میں دو اجنبیوں کو دیکھ کر فرطِ خوف سے لرزاں تھی۔ وہ ان دونوں کے خیالات سن کر گھبرا رہی تھی۔ ایسے میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اسے اصلیت بتلا دوں۔ تمہیں جان کر حیرت ہوگی۔ محبوب! کہ ساری کہانی سننے کے بعد میری بیوی کا خوف ایک دم زائل ہو گیا اور وہ خود اپنے دونوں مہمانوں کی خاطر داری میں دل و جان سے مشغول ہو گئی۔ خود میرے دل سے بھی ایک بوجھ اتر گیا۔ اسی دوران چھوٹی چھوٹی مختلف دقتیں سامنے آئیں ۔ رحمت خاں نے اٹلی کے سفارت خانے سے روابط برقرار رکھے۔ اطالوی سفیر نے استحفاظ کے خیال سے کابل میں مقیم ہر طامس نام کے ایک جرمن سے ملنے کو کہا۔

نیتاجی کی وہ مایوسی

"بعد میں رحمت خاں کو اطالوی سفیر کے پیغامات اسی المانوی سے ملتے تھے۔ ایک دن رحمت خاں کو ہر طامس کے ہاتھوں اطالوی سفیر کا ایک خط ملا۔ یہ خط بڑا ہمت افزا تھا۔ سفیر نے لکھا تھا: "برلن اور روم بڑی بے تابی کے ساتھ بھارت کے عظیم انقلابی سبھاش چندر بوس کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" ہر طامس سے رحمت خاں کا ملنا کسی حد تک مناسب نہیں تھا، اس لیے یہ کیا گیا کہ ہر طامس کی معرفت ملنے والے پیغام رحمت کی بجائے اُتم چند یعنی میں لے آیا کروں۔ نیتاجی کی طرف سے میں نے ہر طامس کی معرفت ایک خط اطالوی سفارت خانے کو بھیجا۔ اس خط میں لکھا تھا "۹ر فروری ۱۹۴۱ء کو سگرونا کارونی چارج ڈی۔ ایفیرس میری دوکان پر آئے اور ایک خط چھوڑ گئے جس میں لکھا تھا کہ "سبھاش بابو کا پیغام روم اور برلن بھیج دیا گیا ہے اور اطالوی سفارت خانہ، ماسکو کو پاسپورٹ بنانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔"

"اس خط کے ایک ہفتہ بعد بھی جب ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا، تو نیتاجی نے ہر طامس کی معرفت پھر ایک خط بھیجا۔ تین ہفتے ہو گئے، لیکن ابھی تک اطالوی سفارت خانے ماسکو سے میرا پاسپورٹ نہیں آیا۔ اسی دن سگرونا

کارونی میرے پاس آئے اور ایک مہر بند لفافہ دے گئے۔ اس خط میں بھی مسئلے کا کوئی حل نہ تھا۔ "ماسکو سے پاسپورٹ ملنے میں ابھی کچھ دقتیں ہیں۔" اس خبر سے ہم لوگ بہت مایوس ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد نیتاجی نے خود سوویت سفیر کے نام ایک طویل خط لکھا۔ اس خط میں ہندوستان سے فرار کی پوری کہانی کا ذکر کر کے انہوں نے سفیر سے ملنے کا وقت مانگا تھا۔ یہ طے ہوا کہ یہ خط ہم خود اپنے ہاتھوں سوویت سفیر تک پہنچائیں گے۔ لیکن ہمارے بہت چاہنے پر بھی ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

"دو دنوں بعد سکرونا کارونی کا ایک دوسرا خط ملا جس سے پتہ چلا کہ سوویت سفارت خانے سے پاسپورٹ ملنے میں ابھی دقتیں ہیں۔ ہاں! اس خط میں یہ بھی اشارہ تھا کہ سبھاش بابو کو لینے کے لیے کچھ آدمی روم سے کابل پہنچ رہے ہیں، لیکن ایک ہفتہ بیت جانے کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ نیتاجی حد درجہ متفکر ہو گئے۔ بلاشبہ وہ مایوس ہو چکے تھے۔ نیتاجی کہیں باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ اس دوران وہ صرف ایک بار میرے ساتھ حاجی جی کے گھر چائے پینے کے لیے گئے۔ حاجی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ نیتاجی کابل میں اب اور زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے سرحد پار کرنے کی ترکیبوں پر کافی سوچا بچارا۔ میرے ذہن میں ایک ایسے آدمی کا نقشہ ابھرا جو کئی بار افغانی سرحد سے ہانگونڈی جا چکا تھا۔

۱۸ مارچ کی صبح

"اس درمیان میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ پشاور سے خریداری کرنے کے لیے میرا ایک دوست جیون لال کابل آیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اسی دوران وہ آدھمکا۔ اس دن اس نے میرے ہی ساتھ کھانے میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا، حالانکہ یہ نئی بات نہیں تھی۔ لیکن اس وقت میں ایک پل کے لیے گھبرا گیا۔ نیتاجی میرے گھر میں تھے، اس لیے اس کو لے جانا قطعی ممکن نہیں تھا۔ میں نے بیوی کی گھر میں ناموجودگی کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔

"دوسرے دن رحمت خاں اور سیما پار کرنے کے لیے مقررہ آدمی میری دوکان پر بیٹھے ہوئے جس وقت اگلے منصوبے پر بات چیت کر رہے تھے، ٹھیک اسی وقت میرا دوست جیون لال پھر نازل ہو گیا۔ جیون لال اس آدمی کو پہلے سے جانتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چونکا۔ پھر اس نے پوچھا آدمی تو پیشہ ور جواری ہے، تمہاری اس سے دوستی کیسے ہو گئی؟ میں چپ رہا۔ رحمت خاں نے چالاکی کی۔ وہ چپ چاپ دوکان سے کھسک گیا۔ بہر حال، جیون لال یہ سمجھ بیٹھا کہ میں ان جواریوں سے ساز باز رکھتا ہوں۔

"شام کو میں نے ساری کہانی سبھاش بابو کو بتائی تو انہوں نے کہا کہ یہ آپ کی مرضی پر ہے، آپ چاہیں تو جیون لال کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہیں، لیکن بہتر تو یہی ہوگا کہ ابھی تھوڑا انتظار کر لیں۔ اگلے دن جیون لال میری دوکان پر ٹھیک اس وقت آ پہنچا جب میں سکرونا کارونی سے باتیں کر رہا تھا۔ کارونی نے مجھے ایک لفافہ دیا،

جسے دیکھ کر جیون لال کا شک اور بھی بڑھ گیا۔ کارونی کے جانے کے بعد اس نے مجھ پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ وہ لفافے کی بابت پوچھتا رہا لیکن میں اسے کسی طرح ٹال گیا۔

"اس کے جانے کے بعد میں نے لفافہ کھول کر خط کو پڑھا۔ خط امید افزا تھا۔ معلوم ہوا کہ نیتاجی کے سفر کا انتظام کرنے والا آدمی روم سے چل چکا ہے اور ایک ہفتہ بعد وہ کابل پہنچ جائے گا۔ اسی دن یہ طے ہوا کہ نیتاجی اپنی تصویر کھنچوانے کے لیے دوپہر بارہ بجے "دارالامان" پہنچ جائیں۔ اسی شام میں نے نیتاجی سے پوچھا۔ آپ افغان سیما سے پار جانے کے لئے اس طے شدہ آدمی سے مدد لینا چاہیں گے یا روم سے آنے والے آدمی کا انتظار کریں گے؟ کافی سوچ بچار کے بعد نیتاجی اس نتیجے پر پہنچے کہ روم سے آنے والے آدمی کے انتظار میں کوئی ویسا حرج نہیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے جیون لال کو حقیقت بتلا دی جائے۔ اگلے دن سگرونا کارونی آئے اور انہوں نے مجھے بتلایا "نیتاجی کا پاسپورٹ بنا تیار رکھا ہے لیکن روم سے آنے والے آدمی کا انتظار کیا جا رہا ہے"۔ یہ خبر کافی فرحت انگیز تھی۔ میں نے سبھاش بابو کے سفر کے سامان کی تیاری شروع کر دی۔ ان کے لئے دو سوٹ سلوائے گئے، اور کچھ ضروری سامان خریدے گئے۔ اطالوی سفارت خانے نے پھر ایک پیغام بھیجا، جس کے مطابق نیتاجی کو ۱۸ مارچ ۱۹۴۱ء کو کابل چھوڑنا تھا۔ اس سلسلے میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ نیتاجی ۱۷ مارچ کو ۸ بجے سگرونا کارونی کی رہائش گاہ پر پہنچ جائیں۔ ۱۶ مارچ سے لگ بھگ تین بجے دن میں سگرونا کارونی خود آئے اور اپنے ساتھ سبھاش کا سوٹ کیس اور دوسرا سامان لے گئے۔

"محبوب بھائی! آخرش ۱۷ مارچ کی صبح ۱۰ بجے نیتاجی میرے گھر سے وداع ہوئے اور یہ وداعی بڑی جذباتی تھی اس وقت میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں انہیں چھوڑنے کے لیے سگرونی کارونی کے گھر تک گیا تھا۔ اگلی صبح دس بجے کے قریب رحمت خاں میری دوکان پر آیا اور اس نے بتایا کہ نیتاجی آج صبح ۹ بجے برلن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو درجن مسافر اور ایک اطالوی بھی تھا۔ پاسپورٹ میں نیتاجی کا نام اطالوی میں "بھوج جاتیا" لکھا ہوا تھا"۔

"سبھاش بابو کے ساتھ روانہ ہونے والے دو درجنوں میں سے ایک کا نام تھا ڈاکٹر ویلر وہ بہت ہی چالاک آدمی تھا اور نیتاجی کی حفاظت کی ذمہ داری اسی آدمی پر تھی۔ ڈاکٹر ویلر نیتاجی کے ساتھ برلن تک رہے۔ کابل سے سوویت سیما تک وہ لوگ موٹر سے گئے، پھر وہاں سے بذریعہ ریل ماسکو کے لیے روانہ ہوئے تھے"۔

تواریخ انہی کے لہو سے لکھی ہے

"کچھ دنوں بعد مجھے جرمنی سے مرسلہ ایک درجن اخبارات ملے جس میں سبھاش بابو کے مع الخیر برلن پہنچنے

کی خبریں چھپی تھیں۔ ان اخباروں میں سے ایک میں نیتاجی کی ایک تصویر بھی تھی، جس کے نیچے جرمن میں لکھا تھا۔
' ہندوستان کے مشہور انقلابی نیتا اور ' بھارتیہ راشٹریہ کانگریس' کے سابق صدر سبھاش چندر بوس جو کچھ دنوں قبل پراسرار طور پر بھارت سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ بحفاظت تمام ۲۸ مارچ ۱۹۴۱ء کو برلن پہنچ گئے ہیں' بعد میں مجھے سگرونی کارونی نے بتایا کہ سبھاش بابو ۲۷ مارچ کو ماسکو پہنچے تھے' جہاں رات بھر رک کر وہ ۲۸ مارچ کو برلن کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ محبوب بھائی! نیتاجی کے ساتھ دو جرمن اس لیے لگائے گئے تھے کہ ہٹلر نہیں چاہتا تھا کہ سبھاش بابو بیچ میں پھنس کر اٹلی یا ماسکو میں ہی رہ جائیں۔ بہرحال، نیتاجی جرمنی پہنچ گئے۔ ادھر حالات نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ میں ایک برطانوی جاسوس کی نظر پر چڑھ گیا تھا' نتیجتاً' مجھے مئی ۱۹۴۱ء میں کابل میں گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے مجھے جلال آباد جیل میں رکھا گیا پھر مجھے لال قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ تمہیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ لال قلعے میں میری ملاقات جیون لال سے ایک قیدی کی صورت میں ہوئی۔ برطانوی سرکار نے اُسے محض اس بنیاد پر گرفتار کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے ملا کرتا تھا۔ بعد میں میری کابل کی ساری جائیداد ضبط کر لی گئی۔"

اتم چند کے ذریعے سنی ہوئی اس کہانی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا اور اکثر میں یہ سوچنے پر مجبور رہا ہوں کہ نیتاجی میں آخر وہ کون سی بات تھی' جس کے چلتے ایک اجنبی ملک میں رہنے والا ایک اجنبی انسان —— اُتم چند بھی اپنی جان جوکھم میں ڈالنے تک سے نہ ہچکا؟ آخر ایسا کیا تھا جسکی بدولت ایک نہایت عام قسم کا انسان اپنی جائیداد لٹا کر بھی' صرف اس بات سے خوش تھا کہ وہ نیتاجی کے کام آیا؟ سچ ہے! مادر وطن کا قرض اور اپنا فرض ادا کرنے کا وہ نادر موقع اتم چند جیسے لوگوں کو جب بھی ملا لوگوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ہندوستان کی یہ آزادی ایسے ہی جانے کتنے گمنام لوگوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے:

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

ہٹلر سے ملاقات

تواریخ کے صفحات پر ایسے لوگوں کا تذکرہ ہو یا نہ ہو' تاریخ ان کی احسان مند ہے، تواریخ انہی کے لہو سے لکھی گئی ہے آنے والی نسلیں اس حقیقت کو سمجھیں بس اتنی ہی میری خواہش ہے۔ ہاں' بہت بعد میں' میری دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اُتم چند سے تب میں اپنے فوجیوں کے ساتھ قید ہو کر لال قلعہ میں آیا تھا۔ لال قلعے ہی میں مجھے یہ خبر ملی کہ اُتم چند بھی یہیں قید ہیں۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ایک دن میرے دوست کیپٹن رام سنگھ نے میری ملاقات اتم چند سے کروادی۔ لال قلعے کے اس زندان خانے میں ہم دونوں کی وہ ملاقات دو سگے بھائیوں کی جذباتی ملاقات تھی۔ بڑی دیر تک ہم دونوں

میں گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اس دن اتم چند نیتاجی کے ہوائی حادثے میں دردناک رحلت کو یاد کر کے رو پڑا تھا۔ وہ لمحات بڑے سوگوار لمحات تھے، ان میں یادِ ماضی کی حسرتیں گھلی ملی ہوئی تھیں، دل کی ہر چوٹ ابھر آئی تھی اور اس میں کسک سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اس دن ماضی کے بہت سارے ورق الٹے تھے اور نیتاجی کیساتھ مل جل کر رہنے کا ایک ایک واقعہ اس کے ذہن میں آرہا تھا اور ذہن سے زبان پر اتر آتا تھا۔ "قسمت سے وہ چند دن ہاتھ آگئے تھے جو نیتاجی جیسے بے نظیر محبِ وطن، شجاعت اور اولوالعزمی کے پیکر اور ایک عظیم قائد و رہنما کی معیت میں گزرے تھے۔"

مجھے ایسا لگا کہ یہ شخص شدتِ جذبات کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہے۔ حالات نے اسے یکسر بدل دیا ہے۔ اس کے خیالات اور تجربات میں پختگی آگئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا "ہندوستان کی آزادی کا وہ بے خوف دیوانہ دراں حالیکہ میرے گھر میں ۴۳ دنوں تک رہا، لیکن آج تک میں نہ جان سکا کہ وہ دن کب اور کیسے بیت گئے؟ لگتا ہے، وہ عظیم ہستی آج بھی میرے سامنے موجود ہے۔ محبوب بھائی! وہ ۴۳ دن میری زندگی کے عجیب سنہرے، پیارے اور بہترین دن تھے۔ زندگی کے قیمتی لمحات، دن، اور ماہ و سال وہ ہوتے ہیں۔ جو کسی پاکیزہ مقصد کے تصوّر میں گزر رہے ہوں، ورنہ سفلی آرزوؤں اور ناکارہ و عبث خیالات میں دن گزرانے سے تو بہتر موت ہے۔ بھائی محبوب! مجھے تو چند ایسے نایاب اور گراں بہا دن مل گئے تھے جن پر میں ہزار سالہ زندگی بھی قربان کر دوں۔ مادرِ وطن کے لئے خود کو نثار کر دینے کے جذبات اور ایسی خوش بختی مجھے نیتاجی کے صدقے میں ملی، اس کے لئے میں ان کا احسان مند ہوں۔"

رخصت ہوتے وقت میں نے دیکھا اُتم چند کی آنکھیں نمناک ہوگئی تھیں۔ ایسے وقت میں انہیں تسلّی دیتے ہوئے میں نے ان سے کہا تھا۔ "بھائی! نیتاجی جیسا انسان کبھی مرتا نہیں ہے وہ زندۂ جاوید اور امر ہیں۔" آج بھی گزرے ہوئے وقت کی ہر یاد میری آنکھوں میں مجسم سی ہو جاتی ہے۔ عمر کی اس منزل میں بھی پہنچ کر ایسا لگتا ہے جیسے یہ سب کل کی باتیں ہیں۔ آج بھی سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ دل کی ہر دھڑکن کسی کو یاد کر رہی ہے!

اور سچ تو یہ ہے کہ اب ہم جیسوں کے پاس چند یادوں کے سوا اور رہ بھی کیا گیا ہے!

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں ‏ ‏ انہی کی یاد میری زندگی ہے!

تاریخ کے فخر و مباہات کا وہ روشن باب جس سے سبھاش چندر بوس کی درخشاں روایت کا آغاز ہوتا ہے اور جس میں ان کے بے مثال کارنامے سنہرے حروف میں لکھے ہوئے ہیں آج ہمارے لیے اور ہماری قوم کے لیے سبق آموز ہیں۔ میں اس درجہ مایوس بھی نہیں کہ ان کارناموں کی طرف کوئی ملتفت نہ ہوگا، نہیں، نہیں!! آج نہ سہی کل یہی عظیم کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہوں گے ؎

بہ زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود ‏ ‏ سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود!

نیتاجی کی خوبیوں اور صفات کا احاطہ کرنا آسان نہیں وہ عصرِ حاضر کے انسانِ کامل تھے، سب سے بڑے "محبِ وطن" سب سے بڑے شجیع اور مادرِ وطن، کے فدائی۔ ان کی عظیم قومی خدمات بے لوث، ان کا جذبۂ "حبِ وطن"، پاکیزہ اور مصفا تھا۔ ان کی "نبضِ ہستی" "خدمت و ایثار کے لئے ہمہ دم" "تپش آمادہ" رہتی تھی۔ زمانے میں اتنی طاقت نہیں کہ ایسے نابغۂ عصر کو فراموش کرسکے یا ایسے زرِ کامل العیار کی درخشندگی کو دھندلا کرسکے وہ اور انکے کارنامے آج بھی ہمارے سامنے ویسے ہی ہیں جیسے کل تھے، اس لئے کہ ؎

جس کو تاریخ پہچانتی ہو ‏ ‏ ایسا انسان مرتا نہیں ہے!

ایک غلام ملک میں تذلیل اور غم و اندوہ کے بے نہایت تجربات حاصل کرنے کے بعد پھر غیر ملکوں کی سرزمین پر آزادی کی جنگ لڑنے کا حوصلہ صرف اور صرف نیتاجی میں ہی تھا ——— میں یہ مانتا ہوں کہ نیتاجی نے اگر اپنی غیر معمولی صلاحیت سے کام نہیں لیا ہوتا تو انگریزی حکومت اتنی جلدی ہندوستان چھوڑنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی۔ دراصل ان کا کابل سے جرمنی پہنچ جانا انگریزی حکومت کے لیے غضب ہوگیا۔ نیتاجی نے جرمنی پہنچ کر سب سے پہلے جو دانشمندانہ کام کیا، وہ تھی ——— ہٹلر سے ملاقات۔

اٹھارہ ہفتہ لمبا سفر

ہٹلر سے اس ملاقات کے دوران نیتاجی نے صاف طور پر اپنا یہ منشا ظاہر کیا: "میں جرمنی میں مقیم بھارتیوں اور عالمی جنگ میں گرفتار کیے ہوئے بھارتی سپاہیوں کو لے کر ایک فوج کی تشکیل اور تنظیم کرنا چاہتا ہوں"۔ ہٹلر نیتاجی کی اس پیشکش پر فوراً راضی ہوگیا۔ شاید اس کی مردم شناس اور تجربہ کار نگاہوں نے نیتاجی کے بلند عزائم، اور ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ بالآخر جنوری ۱۹۴۲ء میں نیتاجی نے "بھارتیہ[1] سوادھینتا لیگ"، کے

---

[1] آزاد ہند فوج

تحت جرمنی میں ایک بٹالین قائم کر لیا۔ نیتاجی ایسی ہی ایک فوجی تنظیم جاپان اور مشرقی ایشیا میں بھی قائم کرنی چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں برلن میں مقیم جاپانی سفیر سے مل کر انہوں نے جاپان میں بھی اسی طرح کی فوجی تنظیم کی تشکیل کا ارادہ ظاہر کیا۔ جاپانی سفیر کو نیتاجی کی یہ پیشکش پسند آئی اور آخر کار جاپان سرکار نے بھی مشرقی ایشیا میں بھارتی فوج کی ایک ٹکڑی (دستہ) منظم کرنے میں تعاون دیا۔ غیر ملکی سرزمین پر نیتاجی کا زوردار خیر مقدم ہوا۔ وہ جس منصوبے کو لے کر بدلیس روانہ ہوئے، یعنی انگریزی حکومت سے ایک فیصلہ کن جنگ کی جائے اسے عملی جامہ پہنانے کا طوفانی دور شروع ہو گیا تھا۔

۸ر فروری ۱۹۴۳ء کو نیتاجی سبھاش چندر بوس عابد حسن شفرانی کے ساتھ ٹوکیو کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بڑا کیف انگیز سفر تھا۔ وہ لوگ کیل سے یو۔ بوٹ (آبدوز جہاز) کے ذریعے بحر اٹلانٹک (اوقیانوس) پار کرتے ہوئے گڈ ہوپ ہوتے ہوئے مڈغاسکر پہنچے۔ یہ سفر چار سو میل لمبا تھا۔ یہاں سے ۲۰ر اپریل ۱۹۴۳ء کو اگلا سفر شروع ہوا۔ یہ سفر جاپانی آبدوز جہاز آئی۔ ۲۹ر سے طے کیا گیا۔ اس بار بحر ہند پار کرنے کے بعد وہ لوگ پینانگ (ملایا) پہنچے۔ پینانگ سے ٹوکیو کا فضائی سفر طے کیا۔ اس پورے سفر میں ان کے ساتھ جاپانی میجر جنرل یاماموتو بھی رہے، جو اس وقت بھارت، جاپان روابطی دَل کے افسر اعلیٰ تھے۔ اسے جاپانی زبان میں "ہیکاری کی کن" کہتے ہیں۔

۱۳ر جون ۱۹۴۳ء کو اٹھارہ ہفتے کے اس لمبے سفر کے بعد نیتاجی ٹوکیو میں تھے۔ اس سفر کے دوران اپنے فالتو اوقات سے انہوں نے کئی طرح کے فائدے حاصل کیے۔ ڈھیروں کتابوں کو پڑھنے اور نوٹس تیار کرنے سے لے کر اپنی کتاب "دی انڈین اسٹرگل" کے پرانے ایڈیشن پر نظر ثانی اور تصحیح بھی کی۔ اس سفر میں انہوں نے مشرقی ایشیائے بعید میں آزاد ہند فوج کو منظم کرنے کے مختلف پہلوؤں پر سوچا بچارا اور عابد حسن شفرانی کے ساتھ مشورے کیے۔

۲۰ر جون ۱۹۴۳ء کو ٹوکیو ریڈیو نے اپنی خبروں میں اعلان کیا کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس جاپان پہنچ گئے ہیں۔ اس خبر کے ساتھ ہی دنیا نے جانا کہ نیتاجی نے انگریزی حکومت کے خلاف اپنے مشن کی زوردار شروعات کر دی ہے۔

ٹوکیو ہوائی اڈے پر نیتاجی کا استقبال کرنے کے لیے جاپانی وزیر اعظم توجو خود آئے تھے۔ ان کے استقبال میں جنرل توجو نے ایک شاندار دعوت بھی دی تھی۔ اس دعوت کے دوران ہی جنرل توجو نے کہا تھا — "جاپان بھارت سے انگریزوں کی ملوکیت ختم کرنے میں ہر طرح سے تعاون کرے گا، انگریز ہندوستانیوں کے دشمن ہیں اور وہ انہیں آزادی نہیں دینی چاہتے۔"

اس زوردار استقبال کا جواب دیتے ہوئے نیتاجی نے کہا تھا: "اوّل عالمی جنگ کے زمانہ سے ہی برطانوی

سیاست داں ہم لوگوں کو دھوکے دیتے چلے آرہے ہیں۔ مگر اب ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ایک لمبے عرصے سے ہم اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ انگریزی سامراج نے ہمارے سماجی، سیاسی، مالی اور تہذیبی ڈھانچوں کو برباد کر دیا ہے۔"

آزادی کا راستہ

راش بہاری بوس ان دنوں سنگاپور میں تھے۔ سبھاش بابو کے جرمنی سے جاپان پہنچنے کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ جنرل توجو کی دعوت پر راش بہاری بوس ۱۳ جون ۱۹۴۳ء کو ٹوکیو پہنچے تھے۔ وہیں پر ان کی ملاقات نیتاجی سبھاش چندر بوس سے ہوئی تھی۔ انہوں نے نیتاجی سے "آزاد ہند فوج" کی باگ ڈور سنبھالنے کو کہا تھا۔ نیتاجی کو سابق طے شدہ پروگرام کے تحت چین جانا تھا، لیکن انہوں نے اپنا پروگرام منسوخ کر دیا۔ ان کا سنگاپور پہنچنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ آخر کار ۲ جولائی ۱۹۴۳ء کو وہ سنگاپور پہنچے۔ وہاں ان کا کافی گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہوا۔ سنگاپور میں وہ ایک ہفتہ ٹھہرے جسے "نیتاجی سبھاش چندر بوس ہفتہ" کہا گیا۔ وہاں انہوں نے کئی جلسوں میں شرکت کی۔ سبھی بھارتیوں نے متفق ہو کر انہیں اپنا نیتا مانا اور پوری مدد دینے کی قسم کھائی۔ اس موقع پر نیتاجی نے کہا "ہمیں دشمن سے بڑی سخت لڑائی لڑنی ہے۔ آزادی کی آخری اور فیصلہ کن جنگ کے لیے ہمیں بھوک اور پیاس سے لڑنا پڑے گا۔" سنگاپور کی اس بین الاقوامی سبھا میں آزاد بھارت کی مستقل سرکار کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ سبھاش بابو نے اپنے رفیق کاروں اور وزراء کے ساتھ سرکار کے متعلق اپنے عہدے اور اخفائے راز کے لیے حلف اٹھوایا۔ یہ منظر دیکھنے والی ساٹھ ہزار نگاہیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔

اگلے دن سنگاپور میں تقریباً پچاس ہزار شہریوں کا زوردار اجتماع ہوا، جس میں "آزاد ہند سرکار" نے انگلینڈ اور امریکہ کے خلاف جنگ کرنے کا اعلان کر دیا۔ "آزاد ہند فوج" نے جنگ کے لیے اپنی پوری تیاری کر لی تھی۔ اپنی فوج کے سامنے تقریر کرتے ہوئے نیتاجی نے کہا ـــــ "بھارت کے سپاہیو، بہادرو، ندیوں، جنگلوں اور پہاڑوں کے پار ہمارا وہ دیش ہے، جہاں کی مٹی سے ہم سب بنے ہیں، جہاں اب ہم جا رہے ہیں۔ سنو، بھارت ورش پکار رہا ہے، اٹھو اب وقت کھونے کا نہیں ہے۔ ہتھیار اٹھاؤ، دلی کا راستہ آزادی کا راستہ ہے۔ دلی چلو۔"

"ساتھیو، میرے سپاہیو، تمہارا نعرہ ہے "دلی چلو" آزادی کی لڑائی میں، ہم میں سے کتنے لوگ بچیں گے یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ فتح ہماری ہوگی۔ ہمارا کام تب تک ختم نہیں ہوگا، جب تک ہمارے جوان دلی کے لال قلعے میں صف بستہ ہو کر فتح کی پریڈ نہیں کریں گے۔ ابھی میں بھوک، پیاس، تکلیف، لمبی کٹھن سیاحت اور موت کے سوا دوسری کسی چیز سے کی نوید نہیں دے سکتا۔

"آزاد ہند فوج خاص الخاص ہندوستان کی قومی فوج ہے اور یہ ہر طرح ہندوستانیوں کے ماتحت

ہے۔ ہم اس فوج میں جاپانیوں کو نہیں آنے دیں گے۔ اگر ہماری خواہش کے خلاف جاپانی بھارت جاتے ہیں، تو ہم انہیں اپنا دشمن سمجھیں گے۔" اگر آپ لوگ مجھ پر اعتبار کریں تو میں آپکو فتح و آزادی کی منزل تک پہنچاؤں گا۔"

۶ رجولائی ۱۹۴۳ء آج "آزاد ہند فوج" کی پریڈ کے دوران جنرل توجو نے فوجیوں کی سلامی لی۔

آزاد ہند سرکار کی تنظیم

نیتاجی رنگون سے جرمنی آئے جہاں سے انہوں نے بین الاقوامی سیاست حاضرہ کا جائزہ لیا اور مستقبل کے لیے فوجی قواعد وضوابط مرتب کیے۔ انہوں نے جرمن ریڈیو کی معرفت "آزاد ہند فوج" کو متعارف کیا۔

یہیں ان کی ملاقات ہوئی تھی یروشلم کے مفتیٔ اعظم سے ہوئی۔ مفتی موصوف عربوں میں کافی مقبول تھے۔ انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف وہ بھی جرمنی سے مدد چاہتے تھے۔ نیتاجی سے ان کی ملاقات جلد ہی دوستی میں بدل گئی اور انہوں نے جرمن ریڈیو سے کئی بار ہندوستانی مسلمانوں کے نام پیغامات نشر کیے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف جنگ آزادی میں پرزور حصہ لینے کی صلاح دی۔

جرمنی میں نیتاجی کی شخصیت مسلم ہو چکی تھی۔ جرمن عوام اور افسران ان کی بے حد عزت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جرمن سرکار بھی انہیں اپنا مہمان خصوصی سمجھتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک بار ایک امریکی اخبار نویس نے نیتاجی سے اپنی ملاقات کے بعد ایک ریڈیائی بیان نشر کیا تھا، "میں برینڈس برگ ہوٹل کے ایک کمرے میں ہندوستانی تحریک آزادی کے ایک عظیم قائد اور انقلابی سبھاش چندر بوس سے ملنے گیا۔ میں تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سبھاش کی شخصیت بڑی شاندار اور عظیم ہے۔ اس انسان کے چہرے پر ایک عجیب جمال وجلال کی تابش ہے جو لوگوں کو فوراً اپنی جانب مائل کر لیتی ہے اور انہیں سرعقیدت جھکا دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ غلامی کے لیے ان کے دل میں سخت نفرت ہے اور ہندوستان کو انگریزوں کی ملوکیت سے جلد از جلد آزاد کرانے کے لیے بے چین ہیں۔" نیتاجی نے جرمنی کی کئی سبھاؤں کو مخاطب کیا اور بھارتی مسائل پر روشنی ڈالی۔ انکی شخصیت سے ہٹلر اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے انہیں "ہزایکسی لینسی فیوہرر" کے لقب سے معزز کیا۔ جرمنی سرکار نے نیتاجی کو بہت ساری سہولتیں دے رکھی تھیں ای۔ ڈبلیو سودبی جے۔ ۱۰۱ سی' نامی ہوائی جہاز اور اپنے کاموں کے لیے ایک طاقتور ٹرانس میٹر کے علاوہ نیتاجی کو یورپین ملکوں میں آنے جانے کے کیلئے پوری آزادی ملی ہوئی تھی۔

جرمنی اور روس کے درمیان جنگی سرگرمیوں کے درمیان نیتاجی خود مقام جنگ پر بھی گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے روس اور جرمنی کے درمیان سمجھوتا کرانے کی بھی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ اس

دوران انہوں نے ایسا اندازہ لگالیا تھا کہ جرمنی ہار جائے گا' ایسے وقت میں جاپان سرکار کی دعوت پر نیتاجی برما چلے گئے' جہاں پہنچ کر انہوں نے مستقل آزاد ہند سرکار کی تشکیل کی۔

مورچے کی طرف کوچ

نیتاجی نے کئی بار اٹلی کا بھی دورہ کیا اور مسولینی سے بھی ملاقات کی۔ اٹلی کے وزیر خارجہ کاؤنٹ سیانو' (جو رشتے میں اسٹالن کے داماد تھے) نے ایک جگہ لکھا ہے ——— "ہندوستانی قائد انقلاب سبھاش چندر بوس مجھ سے ملے۔ انہوں نے اس بات پر بڑی برافروختگی ظاہر کی کہ ہندوستان کے اعلان آزادی کو ابھی تک کیوں دبا رکھا گیا ہے؟

بہر حال' نیتاجی مشرق بعید کے بھارتیوں کو لے کر "آزاد ہند فوج" کی طاقت کو دوگنی اور چوگنی کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ انہوں نے اس علاقے کے بھارتیوں کو مورچہ بند کیا جس کی بنیاد پر انہوں نے ملایا' برما اور تھائی لینڈ کو اپنا مخصوص مرکز بنایا۔ دراصل' ملایا میں آٹھ لاکھ' برما میں چھ لاکھ' اور تھائی لینڈ میں پچپن ہزار ہندوستانی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نیتاجی ان دیشوں کے بھارتیوں سے فوج کے لیے آدمی اور زر چاہتے تھے۔ نیتاجی چین اور انڈونیشیا نہیں جا سکے' اس لیے' ان مقاموں پر اپنے معتبر اور اعلیٰ افسروں کو بھیجا تاکہ بھارتیوں کو فوج میں بھرتی کرنے اور زر اکٹھا کرنے کا کام ہو سکے۔

اپنی پوری تیاری کے بعد نیتاجی نے محسوس کیا کہ تمام جگہوں پر بکھری ہوئی فوج کو ایک موقف پر لایا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رنگون کو ہیڈ کوارٹر بنایا۔ ۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو "آزاد ہند فوج" نے اپنی فوجی تعلیم ختم کی اور "پارٹی نمبر ایک رجمنٹ"، جو "سبھاش بریگیڈ" بھی کہلاتی تھی' ۲۴ نومبر کو رنگون کے لیے روانہ ہوئی۔ تائی پنگ سے روانہ ہونے والی یہ رجمنٹ جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچی' تو وہاں ایک بہت ہی پس و پیش میں ڈالنے والے حالات تھے۔ آخر کار' ان سپاہیوں کو یہ تسلی دینی پڑی کہ ان کے ٹھیک ہوتے ہی اگلی رجمنٹ میں رنگون بھیج دیا جائے گا۔

تائی پنگ سے رنگون پہنچنے میں رجمنٹ کو پانچ ہفتے لگے۔ اس درمیان فوج کو پانچ سو اڑسٹھ کیلو میٹر پیدل چلنا پڑا۔ تمام سپاہی جلدی سے جلدی مورچے پر پہنچنے کے لیے بے چین ہوا تھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اوسطاً اسّی پونڈ کا سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر بھی یہ فوجی ہر روز تقریباً ۴۸ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کیا کرتے تھے۔ آخر کار' یہ رجمنٹ جنوری ۱۹۴۴ء میں رنگون پہنچی۔

۴ جنوری ۱۹۴۴ء نیتاجی ہوائی جہاز کے ذریعہ رنگون آئے اور اپنی رجمنٹ کے معائنہ کے لیے پہنچے۔ فوج کو تین کمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ا رکان کمان کی ذمہ داری سردار جنگ کرنل لکشمن سروپ مشر اور میجر مہرداس مگھ سنگھ اور

اور میجر اجیرا سنگھ کو دی گئی۔ سینا (فوج) کو تین کمانوں میں بانٹنے کے بعد اس کی کچھ خاص یونٹیں بھی بنائی گئیں۔ جنہیں تین گوریلا رجمنٹ تھیں، گاندھی گوریلا رجمنٹ، نہرو گوریلا رجمنٹ، گپت چر دل (خفیہ دل)

"بھارت بھاگ ہے جاگا"

"آزاد ہند سرکار" بننے کے بعد نیتاجی نے جو اپنا منتری منڈل (انجمن وزرا) بنایا اس کا خاکہ کچھ اس طرح تھا راج پرمکھ، پردھان منتری (وزیر اعظم) رکشا اور ودیش منتری (وزارت دفاع اور خارجہ) ان شعبہ جات کی ذمہ داری خود نیتاجی نے سنبھالی۔ کپتان لکشمی سہگل رانی جھانسی رجمنٹ کے انچارج، ایس، اے ایر وزیر اطلاق اور نشر و اشاعت، لیفٹیننٹ کرنل اے سی چٹرجی مالیات، ایم سہائے وزیر غیر عارضی سرکار، راش بہاری بوس پرمکھ صلاح کار، این این سرکار عدالت صلاح کار بنائے گئے۔ اس کے علاوہ لفٹیننٹ کرنل عزیز احمد ان ایس فکل، گلزاری سنگھ اے، ڈی لوک ناتھن، اور شاہ نواز خاں مسلح فوجی ممبر کے روپ میں مقرر کیے گئے۔ "آزاد ہند سرکار" کے حلف اٹھانے کے موقع پر نیتاجی نے فرمایا تھا "ایشور، اللہ، عیسیٰ اور گرو گوبند سنگھ کے نام پر میں یہ پاک حلف اٹھاتا ہوں کہ بھارت اور اس کے ۳۸ کروڑ باشندوں کی آزادی کے لیے میں "سبھاش چندر بوس"، اپنی زندگی کی آخری سانس تک آزادی کی پاکیزہ جنگ جاری رکھوں گا۔ میں ہمیشہ بھارت کا ایک خدمت گزار بنا رہوں گا اور اپنے اڑتیس کروڑ ہندوستانی بھائیوں کی بھلائی اور خیر خواہی کو اپنا فرض اوّل مانتا رہوں گا۔

"آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی بھارت کی آزادی کی حفاظت میں اپنے خون کی آخری بوند تک نذر کرنے کو تیار رہوں گا۔"

یہ قسم عارضی سرکار کے تمام ممبروں نے بھی کھائی تھی۔ اس موقع پر ایک فوجی نوجوان کپتان رام سنگھ نے وہ قومی ترانہ سنایا تھا جس کی دُھن اس نے خود بنائی تھی۔ یہی گیت "آزاد ہند فوج" قومی گیت یا ترانہ مانا گیا۔ یہ ترانہ میجر عابد حسن شفرانی کے افکار عالیہ سے ہے۔ کیپٹن رام سنگھ کی دُھنوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ سننے والوں کے بازو پھڑکنے لگتے تھے۔ اس ترانہ کے چند مصرعے اس طرح ہیں۔

شُبھ سُکھ چین کی برکھا برسے   بھارت بھاگ ہے جاگا
سورج بن کر جگ پر چمکے   بھارت نام سُہاگا!

کیپٹن رام سنگھ آج بھی ہمارے درمیان ہیں۔ سرکار نے انہیں لکھنؤ میں ایک مکان دے رکھا ہے، جہاں آزاد ہند فوج، کا وہ سنگیت فنکار اپنے دل میں بہت ساری فوجی یادوں کا سنسار آباد کیے بیٹھا ہے۔

یہ اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے ؎

اے چارہ ساز اتنی ہی مدت ہے زیست کی — جبتک کہ دردِ عشق ہمارے جگر میں ہے!

آزاد ہند فوج کے زمانے میں کیپٹن رام کی سنگیت کاری اپنے شباب پر تھی، وہ نئی نئی دھنیں بنایا کرتے تھے، جنہیں سُن کر ہم فوجیوں کے جذبات میں ہلچل مچ جاتی تھی۔ نیتاجی کے استقبال میں انہوں نے ایک گیت لکھا تھا، جسے سُن کر آج بھی نیتاجی کے لیے دل بے چین سا ہو جاتا ہے اس کے یہ چند بول یاد آرہے ہیں:

سبھاش جی، سبھاش جی وہ جانِ ہند آگئے — ہے ناز جس پہ ہند کو وہ شان ہند آگئے

ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا

ایسا ہی ایک کیف پرور گیت، امنگوں کو ابھارنے والا گیت، جس کی "دلفریبی عنوان" پہ "جان" "نذر" کرنے کو جی چاہتا تھا کیپٹن رام سنگھ نے "دلی چلو" نعرۂ یلغار کے موقع پر لکھا تھا۔ ذرا ایک مصرعہ سنئے!

دِلّی دِلّی جائیں گے، اپنا ہند بنائیں گے

قصہ مختصر یہ ہے کہ "آزاد ہند فوج" کے لیے سب کچھ نذر کردینے کا جذبہ ہر دل میں مچل رہا تھا۔ ان جذبوں کی طہارت اور صداقت میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ "دِلّی چلو" کا نعرہ سُن کر ہر دِل کی پکار تھی تقاضا تھا۔ تحریک تھی کہ بس ؎

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم — کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا!

۴، فروری ۱۹۴۳ء کو "آزاد ہند فوج" نے کرنل لکشمن سروپ مشرا اور کرنل پتری شرن رتوڑی کی کمان میں ارکان اور منی پور مورچوں پر انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے"، وہ اس طرح بھاگے ع

جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے!

اس وقت میں "برٹش انڈین فوج" میں سیکنڈ لفٹیننٹ تھا۔ میری تعیناتی ملایا کے مورچے پر تھی۔ پھر ۱۹۴۳ء کے ماہ فروری میں مجھے سنگاپور بلا لیا گیا۔ یہیں نیتاجی سبھاش چندر بوس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ فروری کا آخری ہفتہ تھا۔ سنگاپور کے "کیتھے بھون" میں نیتاجی نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا تھا۔ اس دن میں نے ان کی تقریر سنی تھی اور پہلی بار ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا وطن مجھے آواز دے رہا ہو کہ "تیرے خون کے قطروں کی ضرورت آزاد ہند فوج کو ہے"! میں نے اپنے ضمیر کی صاف آواز سنی، "انگریزوں کے لیے نہیں جنگ کرو بلکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرو" اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا

کہ ایسا ہی ہوگا' اور نیتاجی کے سامنے جاکر اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا۔ نیتاجی نے میرے جذبوں کی صداقت کا اسی وقت اندازہ کرلیا تھا اور میرے نہاں خانۂ دل کی بے تابیوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا' چنانچہ انہوں نے مجھے نومنظم "آزاد ہند فوج" میں بھرتی کرلیا تھا۔ بعد میں میری لگن کو دیکھتے ہوئے نیتاجی نے مجھے مارچ ۴۴ء میں معتمد عساکر کے اہم عہدے پر متعین کیا تھا' اور اس سلسلے میں جو متعلقہ فرائض تھے ان سے میں بخوبی عہدہ برآ ہوتا رہا۔ ہاں! وہ میری زندگی کا بڑا شاندار اور خوشگوار دن تھا۔ اگر سچ پوچھیے تو ہمارے دیش میں تلک' گاندھی' نہرو' پٹیل اور مولانا آزاد وغیرہ جیسی عظیم ہستیاں ہوئیں' لیکن کوئی مجھ سے آج بھی پوچھے کہ محبوب! تم کس کے لیے اپنی جان دوگے' تو میرا جواب یہی ہوگا کہ صرف ایک شخص کے لیے اور وہ ہے 'نیتاجی سبھاش چندر بوس''!

اگر مجھے سو زندگیاں بھی ملیں' تو میں ہر بار اپنے محبوب نیتاجی کے لیے قربان ہونے کو تیار رہوں' بایں ہمہ پھر بھی شاید یہ حسرت رہ ہی جائے۔

دراصل' نیتاجی کی کچھ ایسی ہی شخصیت تھی اور وہ ایسے ہی انسان اعلیٰ تھے جن کی ایک توجہ نے مجھے بھارتی بنادیا' جس پر ہم آج فخر کرسکتے ہیں' ناز کرسکتے ہیں!

کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار!

••

آزاد ھند کا ترانہ ☆

شبھ سکھ چین کی برکھا برسے، بھارت بھاگ ہے جاگا
پنجاب، سندھ، گجرات، مراٹھا، دراوڑ، اتکل، بنگا
چنچل ساگر وندھیا، ہمالہ، نیلا جمنا گنگا
تیرے نت گن گائیں، تجھ سے جیون پائیں
سب تن پائے آشا
سورج بن کر جگ پر چمکے، بھارت نام سبھاگا
جے ہو، جے ہو، جے ہو، جے، جے، جے، جے ہو
بھارت نام سبھاگا

سب کے دل میں پریت بسائے، تیری میٹھی بانی
ھر صوبے کے رہنے والے، ہر مذہب کے پرانی
سارے بھید اور فرق مٹا کے، گود میں تیری آکے
گوندھیں پریم کی مالا
سورج بن کر جگ پر چمکے، بھارت نام سبھاگا
جے ہو، جے ہو، جے ہو، جے، جے، جے، جے ہو
بھارت نام سبھاگا

صبح سویرے پنکھ پکھیرو، تیرے ہی گن گائیں
رس سے بھری بھرپور ہوائیں، جیون میں رت لائیں
سب مل کر جے ہند پکاریں، آزاد ہند کے نعرے
پیارا دیش ہمارا
سورج بن کر جگ پر چمکے، بھارت نام سبھاگا
جے ہو، جے ہو، جے ہو، جے، جے، جے، جے ہو
بھارت نام سبھاگا!

☆ آزاد ھند فوج کا یہ ترانہ آئی۔این۔اے کے ممتاز احمد اور عابد حسن صفرانی نے لکھا اور کیپٹن رام سنگھ نے کمپوز کیا تھا۔

ضمیمہ

خدا بخش لائبریری میں

کرنل محبوب کی چند تقریریں

دیش کو توڑنے والوں کو پہچانو

فساد میں کوئی لیڈر نہیں مارا جاتا

ہمارا دیش مختلف رنگ روپ، ذات و نسل، زبان و مذاہب اور مختلف کھان پان کا مجموعہ ہے، یہی ہمارے ملک کی خصوصیت ہے۔ ہمارے ملک میں مذاہب کا بھی گہرا نقش ہے جو اس ملک کی اساس ہے ہمیں ایسے رنگارنگ دیش پر فخر ہے۔ ہمارے دیش نے بڑے بڑے رہنماؤں کو جنم دیا، گاندھی، نہرو، آزاد، جناح، جن کی حیثیت بین الاقوامی تھی، کیا ہم اپنی نگاہوں کے سامنے اس ملک کو ٹوٹنے اور برباد ہونے دیں گے ہرگز نہیں۔ میں ہندو مسلم کی بات نہیں کرتا میں تو کہتا ہوں کہ ایک ہندستانی نے اپنے ہندستانی بھائی کو مارا، مارنے والا اور مرنے والا دونوں اسی ملک کے سپوت ہیں۔ تمام باشندگان ہند ایک ملت ہیں ان میں کوئی امتیاز کوئی تفریق نہیں۔ ملک کی تقسیم سے ملک کمزور ہوتا ہے، تقسیم پاکستان کے سبب بھی ہمارا ملک کمزور ہوا، اسلیے ہمیں اس ملک کو مزید ٹوٹنے سے بچانا ہے اور ان عناصر کے خلاف علم جہاد بلند کرنا ہے جو اس ملک کو توڑنے کے درپے ہیں۔ وہ جس نے گاندھی جی کا قتل کیا وہ بھی کوئی غیر نہیں تھا ہندستانی تھا مسز اندرا گاندھی کا قتل کرنے والا بھی ہندستانی تھا اور جو تو یہ کہ وہ محافظ تھا۔ بھلا ایک سپاہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ کسی خاتون پر ہاتھ اٹھائے؟ پٹنہ میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا، ان دنگوں کے لیے پوری کمیونٹی کو ذمہ دار قرار نہیں دینا چاہیے، ایک چھوٹا سا طبقہ فساد کراتا ہے، فساد میں بھی کوئی پنڈت کوئی ملا یا کوئی رہنما کبھی مارا نہیں جاتا بلکہ نچلے طبقے کے عوام مارے جاتے ہیں، یہ کرائم ہے۔ ہمیں چاہیے کہ گاؤں گاؤں، محلہ محلہ گھومیں اور بتائیں کہ ہم نے بڑی قربانیاں دے کر اس ملک کو بچایا ہے آزاد کرایا ہے، ہم کسی کو اس ملک میں فساد مچانے کی اجازت نہیں دینگے اس سے خود ہمارا اور ملک کا نقصان ہوگا، مذہب تو بہت ضروری چیز ہے یہ کسی پیڑ کی جڑ کی طرح ہے مگر سچا مذہب۔ صرف مندر مسجد جانا ہی مذہب نہیں ہے مذہب ہمیں رواداری، برابری، اتحاد، عفو و درگذر اور اخلاقی قدروں کا سبق سکھاتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا راکیش شرما جب چاند پر گیا اور اس سے پوچھا گیا ہندستان کیسا نظر آرہا ہے اس نے یہی کہا تھا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا۔ یہی ہے ہمارا ہندستان غور فرمایئے اس ہندستانی کو سب سے اچھا اپنا وطن نظر آیا، یہ حب الوطنی کی پہچان ہے۔ ہمارا بھارت تو ایک ماں کی طرح ہے جو اپنے آغوش میں بلا امتیاز و تفریق ہر اچھے برے کالے گورے کو سمیٹے ہوئے ہے اس کی محبت اور شفقت سب کے ساتھ یکساں

ہے، ہمیں بھی چاہتے کہ اپنی مادر وطن کی آبرو پر کوئی آنچ آنے کا موقع نہیں دیں۔ اسکے لیے ہر طبقہ کے لوگوں کو بالخصوص شاعروں ادیبوں، دانشوروں، سماجی کارکنوں کو اٹھنا ہوگا اور کوئی اقدام کرنا ہوگا۔ ہم بوڑھے لوگ تو چند دنوں کے مہمان ہیں، نوجوانوں کی پوری عمر باقی ہے انہیں اس ملک کو زیادہ ترقی یافتہ بنانا ہے۔ ہر وہ ہندستانی جو اس ملک میں پیدا ہوا وہ برابر کا حقدار ہے، ہم ہندو اسلئے ہو جاتے ہیں کہ ہندو گھر میں پیدا ہوئے مسلمان اسلئے ہو جاتے ہیں کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، ہم سب برابر ہیں، ہمارے یہاں تعلیم کی کمی ہے خاص کر اچھی تعلیم۔ تعلیمی سطح پر بھی اس ملک کو آگے بڑھانا ہوگا۔ پورا اپروچ یہ ہے کہ ہندستان ہمارا ہے آپ کا ہے سب کا ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں اچھے زیادہ ہیں خراب کم، ہم اپنے آپ کو اچھا ہندوستانی بنائیں، دوسرا ٹھیک ہو نہ ہو یہ اسکی ذمہ داری ہے۔

(خدا بخش لائبریری میں ایک تقریر سے اقتباس)

ہندستانی ہندستان کا سب سے بڑا دشمن بن گیا

ہندستان صرف ایک ملک نہیں ایک برّاعظم ہے، یہاں بھانت بھانت کے لوگ رہتے بستے ہیں۔ طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں، طرح طرح کا باس پہنتے ہیں، قسم قسم کی تہذیب قسم قسم کا تمدن ہے، یہ دیش مختلف مذاہب، مختلف نسل، مختلف زبان اور مختلف رنگ روپ کے لوگوں کا ایک ملا جلا سنگم ہے، یہ صدرنگی ہی دراصل اس ملک کا حسن ہے جو اس ملک کو حسین اور عظیم بناتی ہے۔ ہم ایک ساتھ رہتے ہیں کھاتے پیتے ہیں ہنستے بولتے ہیں کبھی لڑ بھی جاتے ہیں لیکن جب بھی دیش پر آنچ آتی ہے ہم سب ایک ہو جاتے ہیں، اپنی قومیت پر کوئی آنچ ہم آنے نہیں دیتے، یہ یقیناً بہت بڑی بات ہے۔ ہمارے ملک میں مذہب کی بنیاد بہت گہری اور وسیع ہے مگر مذہب کی روح اور مذہب کی اسپرٹ سے ہم ناآشنا ہیں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ ملک ہمارا ہے، آپ کا ہے، ہم سب کا ہے اور ہم سب کو مل کر اس ملک کو بچانا ہے، اس ملک کو آگے بڑھانا ہے۔ آیئے! ہم سب مل کر اس ملک کی خدمت کریں اور اس ملک میں چار چاند لگائیں۔ رواداری اس ملک کی روایت رہی ہے، ہمیں اپنی اس روایت کی حفاظت کرنی ہے، ہمیں ایک دوسرے سے رابطہ رکھنا چاہئے، ایک دوسرے سے ملنا چاہئے اور آپسی گفتگو سے اپنے مسائل کا حل نکالنا چاہئے۔

جب ہندستان آزادی کی لڑائی لڑ رہا تھا تو اس وقت دانشوروں کا بڑا رول تھا لیکن ملک آزاد ہو جانے کے بعد کیا ہمارے دانشوروں نے اتنا ہی جذبہ دکھایا اتنا ہی رول ادا کیا جو لڑائی سے وقت ادا کر رہے تھے؟ فیصلہ آپ خود کیجئے۔ ہندستان صرف ایک ملک نہیں ایک برّاعظم ہے، یہ ایک وشال دیش ہے۔ یہاں مختلف زبانیں مختلف تہذیبیں، مختلف رہن سہن مختلف مذاہب کے لوگ رہتے بستے ہیں، یہی رنگارنگی اس ملک کا حسن ہے۔ محبت میں نااتفاقی بھی ہوتی ہے، لوگ آپس میں لڑتے بھی ہیں لیکن جب ملک پر خطرہ ہو تو سب ایک ہو جاتے ہیں۔ ابھی جو خطرہ ہے وہ بہت بڑا ہے، ہندستان کا دشمن باہر سے آکر ہمیں کم نقصان پہنچا سکتا ہے، بڑا دشمن خود ہندستانی ہے جس سے زیادہ نقصان کا خدشہ ہے۔ آج ذات پات کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے افسوس کی بات ہے۔ یہ کہنا کہ چونکہ ہم اسّی فیصدی ہیں اسلئے میرا جو حق ہے پورے ہندستان میں، ماننا ہی چاہئے، یہ ہندستان کی عظمت کے خلاف ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم اسّی فیصدی کو ریپریزنٹ کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہے۔ اسّی فیصدی سے زیادہ لوگ ہندستانیت رکھنا چاہتے ہیں، اس ملک کو بڑھانا چاہتے

ہیں۔ یہ دیش ہمارا ہے، آپ کا ہے، ہم سب کا ہے۔ اس دیش کی خدمت ہم نہ کریں تو کون کرے گا؟ اس ملک کو ہم آگے نہ بڑھائیں تو کون بڑھائے گا، کیا ہمارا فرض نہیں کہ دیش کی خدمت کریں؟ دیش کی خدمت بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ دیش کی خاطر مرنے والا مرتا نہیں بلکہ امر ہو جاتا ہے۔ بھگت سنگھ، چندر شیکھر، آزاد، اشفاق اللہ، نیتاجی جنہوں نے دیش کی خاطر اپنی جانیں دیں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ وہ جو شاعر ہیں ادیب ہیں ان کے ہاتھ میں بڑی طاقت ہے وہ دل ہلا سکتے ہیں، رلا سکتے ہیں، قوم کو جگا سکتے ہیں، انہیں راہ راست پر لا سکتے ہیں۔

دیش آپ سے کچھ مانگ رہا ہے، ہم سے کچھ طلب کر رہا ہے، ہم نہ دیں گے تو کون دے گا!

(خدا بخش لائبریری میں ایک تقریر سے)